ADBI MAHAZ-OCT-17

Thursday, October 26, 2017
4:39 PM

1

بیادِ پروفیسر سید منظر حسن دسنوی مرحوم

اور سید شکیل دسنوی مرحوم

شعر و ادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان

سہ ماہی **ادبی محاذ** کٹک

اشاعت کا تیرھواں سال	۵۴/رواں شمارہ

سر پرست: انجینئر سید آصف دسنوی

مدیر اعلیٰ: سعید رحمانی

موبائل۔ 07978439220 (صرف SMS کے لیے)

مدیر	معاون مدیر
سید نفیس دسنوی	سیّد نور الٰہی ناطق
Mob:9437067585	Mob:9237427933

منیجنگ ایڈیٹر

سمیع الحق شاکر موبائل 9861148800

کمپیوٹر کمپوزنگ:۔ سید مصطفےٰ علی موبائل۔ 8984218600

مجلس مشاورت

رؤف خیر، ڈاکٹر اسلم حنیف، پروفیسر احتشام اختر، ظفر اقبال ظفر، رفیق شاہین، شارق عدیل، غلام ربانی فدا، اشفاق نجمی، حیرت فرخ آبادی، عبدالمتین جامی، حبیب سیفی، شیخ منور حبیبی، حفیظ فاروقی، شیخ قریش، ڈاکٹر معصوم شرقی، ڈاکٹر قمر الزماں، صلاح الدین تسکین

قانونی مشیر: محمد فیض الدین خاں (ایڈوکیٹ، ہائی کورٹ)

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

سعید رحمانی، اخبار اڑیسہ پبلی کیشنز، دیوان بازار۔ پوسٹ۔ بخشی بازار، کٹک۔ 753001

09437067585 (ضروری جانکاری کے لیے)

E-mail: adbimahaz@gmail.com

E-mail: Sayeedrahmani@gmail..com

Website: www.sayeedrahmani.blogspot.com

www.adbimahaz.yolasite.com

قیمت فی شمارہ: ۲۵/روپے زرِ سالانہ: ۱۰۰/روپے

رجسٹری ڈاک سے زرِ سالانہ۔۱۸۰/روپے

خصوصی زرِ سالانہ: ۲۰۰/روپے بیرونِ ممالک: ۲۵/امریکی ڈالر

(چیک یا ڈرافٹ پر نام کی جگہ صرف Md.Sayeed لکھیں۔ پتہ نہ لکھیں۔ چیک کے ذریعہ زرِ سالانہ ۱۲۵/روپے ارسال کریں۔ بیرونِ ملک کے لئے ۳۰/امریکی ڈالر)

IndianOverseasBank-A/CNo.172201000001688

IFSC Code-IOBA0001722-Branch-HaripurRoad,Cuttack

عدالتی چارہ جوئی صرف کٹک کی عدلیہ میں قابلِ سماعت ہوگی

پبلیشر و پرنٹر شیخ قریش نے چتا پریس قاضی بازار سے چھپوا کر دفتر ادبی محاذ۔ دیوان بازار کٹک۔ 753001 سے شائع کیا۔

یادوں کی دہلیز سے

سید شکیل دسنوی مرحوم

غزل

سایہ سایہ جلتا ہوں میں
ساون میں بھی پیاسا ہوں میں

کتنے شکستہ ارمانوں کا
چلتا پھرتا سایہ ہوں میں

اور ذرا کچھ دیر تو ٹھہرو
اک اک پل کو ترسا ہوں میں

دُھن میں کسی کی کھویا کھویا
جیسا تھا میں ویسا ہوں میں

پل دو پل تو جی لینے دو
شام کا ڈھلتا سایا ہوں میں

اب تو شکیلؔ اک جاتی رُت کا
آوارہ سا جھونکا ہوں میں

بشکریہ

مدثر حسن (حیدر آباد)

فلکِ سیماب کے بدرِ کامل بی۔ ایس جین۔ جوہرؔ صاحب درحقیقت وہ مہتابِ درخشاں ہیں جس کی ضیا پاشیوں سے پوری اردو دنیا منور ہورہی ہے۔ موصوف نہایت خلیق، ملنسار اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ انسانیت نوازی، ہمدردی، بھائی چارہ، قومی یکجہتی اور حب الوطنی ان کا شیوہ ہے۔ ان کی اس دلنواز شخصیت کا خوشگوار عکس ان کی شاعری میں نظر آنا فطری امر ہے۔ برسوں کی ریاضت اور مشق و مزاولت نے ان کی شاعری کو نہ صرف زیب و زینت عطا کی ہے بلکہ میرؔ و غالبؔ کی روایت میں توسیع کرنے کا ہنر بھی بخشا ہے۔ ان سب کے ساتھ ان کی شاعری محبت اور ہمدردی کا آفاقی پیغام اپنے اندر رکھتی ہے جس کی بنا پر انھیں شاعرِ انسانیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ زیرِ نظر مجموعہ

کیف وکرب

ان کی ساتویں پیش کش ہے جس میں غزل، گیت، دوہا غزل اور توشیحی غزل جیسی اصناف ان کی تخلیقی شادابیوں کا دلکش اشاریہ ہیں۔ اس کے قبل جو چھ مجموعے شایع ہو چکے ہیں ان کے نام ہیں: ترانۂ بیداری، ساز و مضراب، خواب و خیال، سوز و گداز، شعر و نغمہ اور صوت و صدا۔

☆ **پروفیسر خالد حسین خاں:**۔ جوہرؔ صاحب کا اختصاص یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے عہد کی مروجہ تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر وہی شاعری کی جو ان کے دماغ نے مناسب سمجھا اور دل نے ان کے دماغ پر جیسی دستک دی۔

☆ **پروفیسر عبدالقوی دسنوی:**۔ ان کی کامیابی کی وجہ ان کے مزاج کی سادگی، صالح جذبات کی ترجمانی، خیالات کی پاکیزگی، فکر کی گہرائی کے ساتھ عام فہم زبان کی روانی ہے۔ بلاشبہہ ان کی غزلیں ان کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں، وطن کے حالات سے بھی باخبر کرتی ہیں۔ ان کے صحت مند جذبات اور وطن سے بے پناہ محبت کا بھی اظہار کرتی ہیں۔

☆ **متین طارق باغپتی:**۔ جوہرؔ صاحب صالح مثبت فکر کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی میں راست روی، فلاح اور تعمیر و ترقی کو اہمیت دیتے ہیں۔

شاعرِ انسانیت ہیں جن کا جوہرؔ نام ہے
شاعری جن کی محبت کا حسیں پیغام ہے

سعید رحمانی

(اردو اور دیوناگری میں)

صفحات ۔۴۰۴ / قیمت ۔۲۵۰ / روپے

شاعر کا پتہ :۔ بی۔ ایس۔ جین جوہر
بی 7 / انڈسٹریل اسٹیٹ۔ پرتاپور
میرٹھ۔ 250103 (یو۔ پی)
موبائل۔ 09358400900
E-mail:agromec@vsnl.com

چند اشعار

چاہے جس نام سے بھگوان پکارا جائے
ایشور، اللہ کہ رحمان پکارا جائے
ہم تو انسان کی اولاد ہیں انسان بنیں
ہم کو ہندو نہ مسلمان پکارا جائے

آئے انسانیت کے مندر میں
پیچھے چھوڑ آیے ہیں ہم دیر و حرم
خواب جنت کے نہ دیکھیں تو بنائیں
اپنے ہندوستان کو رشکِ ارم

ملے گی لذتِ بے پایاں زندگی میں تمہیں
کسی کے پاؤں سے کانٹا نکال کر دیکھو
کہیں تعصب و نفرت کی بو نہ آیے گی
مرے کلام کو پورا کھنگال کر دیکھو

اس شمارے میں

محاذِ اول

قاضی مشتاق احمد
B/6,RAY-VENUE SOCIETY
I.C.S Colony. PUNE-411007(M.S)

اُردو زبان کا عروج: سوچتے رہیے کہ اس خواب کی تعبیر ہے کیا؟

اردو کی نئی نسل شاید اس بات پر یقین نہیں کرے گی کہ ساٹھ دہائی میں اردو زبان کی کتابیں ایک روپے سے بھی کم قیمت میں مہیا نہیں۔ یہ معجزہ پاکٹ سیریز کی مقبولیت کی وجہ سے ہوا تھا۔ میں اُس دور سے کتابی دنیا سے جُڑا ہوا ہوں۔ سٹار پاکٹ سیریز (اردو کے تحت) میری کئی کتابیں پاکٹ بک سیریز میں چھپ کر مقبول ہوئیں۔ اس وقت میرے سامنے اس دور میں شائع ہونے والے کثیر الاشاعت ماہنامہ ''جاسوسی پنجہ'' (جنوری ۱۹۶۴ء) کا ایک شمارہ ہے۔ اس شمارے کے صفحہ 134 سے 136 پر سٹار پاکٹ سیریز کی شائع کردہ ایک سو چالیس کتابوں کا اشتہار ہے۔ کتاب کی قیمت فی کتاب ایک روپے ہے۔ اس فہرست میں کرشن چندر کی کتاب 'گدھے کی واپسی' گلشن نندہ (پانچ نائی) دت بھارتی (سات ناول + ایک افسانوی مجموعہ) اکرم الہ آبادی (دس جاسوسی ناول) عادل رشید (گیارہ ناول) جمنا داس اختر (پانچ ناول) ٹیگور (کابلی والا، گورا، زلزلہ) مرزا سودا (امراؤ جان) امرتا پریتم (دو آوازیں۔ ڈاکٹر دیو) شعری مجموعے: جوش ملیح آبادی (قطرات و قلزم) ساحر لدھیانوی (تلخیاں۔ گاتا جائے بنجارہ۔ ساحر اور اس کی شاعری) قتیل شفائی (جل ترنگ) جان نثار اختر (نذر بُتاں) فراق گورکھپوری (روپ) ان کے علاوہ شیخ سعدی کی گلستاں، خلیل جبران کی پاگل ریت اور جھاگ، ڈاکٹر رادھا کرشن (اندھیرا مٹاؤ، دیا جلاؤ) الف لیلیٰ طلسم ہوش ربا، طوطا مینا کے انتخاب، ذرا سے، (پرکاش پنڈت) اور اس طرح اپنی پسند کی کم از کم دس کتابیں منگوانے پر سبھی مصنفین کی دستخط شدہ تصاویر سے مزین ''آج کا ادب'' کا خاص نمبر مفت۔ ایک روپے فی کتاب کی فہرست بہت طویل ہے لیکن اس میں شامل کتابوں کی فہرست اختر الایمان (یادیں) خواجہ احمد عباس (کہتے ہیں جس کو عشق) کرشن چندر (درد کا ہنر) شکیل بدایوانی (کہیں دیپ جلے کہیں دل) کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اب یہ بھی سُن لیجئے کہ اُس زمانے کے بیسٹ سیلر ناول دو ڈھائی لاکھ کی تعداد میں بک جاتے تھے۔ ان میں گلشن نندہ اور دت بھارتی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہم جیسے اس زمانے کے تازہ دم ادیبوں کی کتابیں بھی دس سے پندرہ ہزار کی تعداد میں بک جاتی تھیں۔ کاسی کا سب سے بڑا ذریعہ ریلوے اسٹیشن کے وئیلر کمپنی کے بک اسٹال تھے جو اردو کتابوں، رسائل اور اخبارات سے لدے رہتے تھے۔ (اب یہ عالم ہے کہ ڈھونڈتے رہ جایئے) ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اردو کی خصوصیت ہے کہ اسے سیکھنے والے کسی زبان کے الفاظ کی صحیح ادائیگی کے قابل ہو جاتے ہیں۔ غیر اردو طبقہ اردو کی شیرینی سے متاثر ہے لیکن خود اردو والے اپنی بے حسی سے باز نہیں آتے۔ وہ ملٹی پلیکس میں ڈھائی سو روپے کا ٹکٹ خریدنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے لیکن اگر انھیں ڈھائی روپے کا اردو خریدنے کے لیے کہیے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ اردو کا کلاسیکل ادب اب محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ گیا ہے، انھیں پڑھنے اور سمجھنے کے لیے لغات کی ضرورت آن پڑتی ہے۔ نئی نسل کے بچے یہ سوچ کر خوش ہیں کہ وہ فراٹے دار انگریزی بول کر اپنی قابلیت کا لوہا منوا سکتے ہیں۔ انھیں اردو زبان کی شیرینی، آوازوں کی کیفیات کو پرکھنے اور سمجھنے والی سماعت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ اردو واحد ہندوستانی زبان ہے جسے پورے ہندوستان کو آپس میں جوڑنے کا شرف حاصل ہے۔ یہ زبان سوشل میڈیا کے بہاؤ میں بہہ نہیں گئی بلکہ اس نے ملک اور ممالک غیر میں بھی اردو کی نئی بستیاں بسائی ہیں۔ چند برس پہلے میں ماریشس گیا تھا۔ ایک ڈپارٹ منٹل اسٹور کے مالک اور ملازمین کو میں نے اردو میں بات کرتے سنا تو مجھے تعجب ہوا۔ (ماریشس کی مقامی زبان پرول (prole) ہے جو دراصل فرانسیسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے)۔ جب میں نے اُن سے پوچھا کہ ''کیا آپ اردو زبان جانتے ہیں'' تو انھوں نے جواب دیا ''جی! ہماری مادری زبان تو یہی ہے۔ ہمارے آبا و اجداد ہندوستان سے آئے تھے۔ اردو یہاں رہ کر کچھ یاد رہی کچھ بھول گئے''۔ وہاں کے ٹیلی ویژن پر ہندوستان کے ای ٹی وی (اردو) کے پروگرام دکھایے جاتے ہیں۔ پرائمری اسکول میں اردو زبان بھی پڑھائی جاتی ہے۔

یہ بات قابل اطمینان ہے کہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں ''گوگل''، جیسے سرچ انجن نے بھی اردو کو اپنا لیا ہے۔ فیس بک سے ماریشش کے علاوہ کئی اور ممالک اردو سے جڑ گئے ہیں۔ کاش کوئی ایسا ٹیکنالوجی آجائے کہ اس ملک میں رہنے والے لوگ اردو سے جڑ جائیں جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو 'اردو والے' کہتے ہیں۔

روکے دنیا میں ہے یوں ترکِ ہوس کی کوشش
جس طرح اپنے ہی سایہ سے گریزاں ہونا

محاذِ ثانی

عبدالمتین جامی

کیا عروضیات کا علم شاعری کے لئے ضروری ہے؟

افسوس کی بات ہے کہ جب ایک مصنف بڑی مغز ماری اور جاں فشانی کے ساتھ اپنی تخلیق کردہ کتاب کو ہزاروں کی لاگت میں شائع کر کے مفت میں تقسیم کرتا ہے تو اس کو قارئین کی اکثریت پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ اس کتاب کی افادیت کیا ہے' کس لئے لکھی گئی ہے کم از کم اس کا علم بھی انھیں نہیں ہوتا۔ دراصل جدید ٹکنولوجی اور ماس میڈیا کے پھیلاؤ کے سبب پرنٹ میڈیا کے قارئین کی تعداد گھٹنے لگی ہے۔ بیشتر لوگ ماس میڈیا سے اپنی ادبی پیاس بجھا لیتے ہیں اور کتابیں قارئین کی توجہ سے محروم ہو جاتی ہیں۔

دوسری طرف المیہ یہ ہے کہ موزوں طبع شعرا چند گنے چنے آسان اوزان میں شعر کہہ کر دوستوں کو سنا دیتے ہیں۔ پھر بھی ان میں خامیاں رہ جاتی ہیں۔ صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے وہ کم علمی کے صحرا میں بھٹکنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کلام میں خامیوں کے باوجود ایسے شعرا ترنم کی وجہ سے داد و تحسین وصول کر لیتے ہیں۔ مشاعرہ گاہ میں ہر کوئی تو جاہل نہیں ہوتا' کچھ پڑھے لکھے لوگ بھی موجود رہتے ہیں جو کہ ان خامیوں پر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان نو وارد شعرا کے اندر نہ تو اوزان کا شعور ہوتا ہے اور نہ ہی بحروں کا ادراک۔ زبان میں خامیاں ہوتی ہیں جو کہ سنجیدہ سامعین کی سماعت پر بار گزرتی ہیں۔

شاعری میں یہ کج روئی دراصل جدیدیت کی دین ہے۔ گزشتہ صدی کی پانچویں اور چھٹی دہائی میں در آئی جدیدیت کے بعد استاذی اور شاگردی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔ ہر نو مشق شاعر اپنے ٹوٹے پھوٹے کلام کو استاذ سے اصلاح کرانے کے بعد ہی مشاعرے میں پیش کرتا تھا۔ لیکن ۲۱ ویں صدی میں یہ منظر نامہ بالکل بدل چکا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے شعر کہہ کر داد وصول کرنے والا نو مشق بھی کسی استاد سے رجوع کرنے کو کسرِ شان سمجھتا ہے۔

ناچیز نے ایک جگہ لکھا تھا کہ " ایسے پُر گو شاعروں کی مثالیں ہیں جن کے بعض اشعار پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی طبیعت میں موزونیت نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ بہت سے نام نہاد کہنہ مشق شعرا بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف و محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) اور بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) میں فرق محسوس نہیں کرتے بلکہ ایک ہی غزل میں ان دونوں کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔" بقول شاعر "بحر ہزج میں ڈال کر بحر رمل چلے"

نتیجہ یہ ہے کہ ادھ کچری شاعری کی ڈھیر لگتی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے جیسے استاد ویسے شاگرد۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ Print Media کی سہولت نے ہر ایک کو راتوں رات مشہور ہونے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ ہر کوئی خود کو صف اول کا شاعر ثابت کرنے پر تلا ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی ایک شاعر کو اس کا ایک ہی شعر شہرت کے بام تک پہنچا دیتا ہے۔ آج کل عروض کی کتابیں آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں راقم الحروف کا مشورہ ہے کہ نو مشق شعرا ان کتابوں سے استفادہ کریں۔ جہاں سمجھ میں نہ آئے اساتذہ سے رجوع کریں۔ علامہ ناوک حمزہ پوری صاحب کی ایک تحریر درج کر کے یہ کہنا چاہوں گا کہ "بہت ہو گیا' اردو غزلیہ شاعری کے ہزاروں مجموعے شائع ہو گئے۔ اب ہر کوئی " لکھے کم پڑھے زیادہ" کے اصول پر گامزن ہو جائے"۔ آخر میں یہی کہنا چاہوں گا شاعری میں اگر اعتبار حاصل کرنا ہے تو عروض کی جانکاری لازمی ہے۔ ایسا شاعر جس کی شاعری میں خامیاں ہوں وہ اگر مجموعوں کے ڈھیر بھی لگا دے تو اہلِ ادب کی نظر میں اعتبار حاصل نہیں کر سکتا۔

☆☆☆

ادبی محاذ کا تازہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے مطالعہ کے بعد حسبِ معمول اپنی گرانقدر اور مفید آرا سے ہمیں نوازیں گے۔ اس بار اڑیسہ کے ایک ایسے البیلے شاعر کا گوشہ پیش خدمت جو تصور کے باغ میں ادب کے رنگ برنگی پھول کھلاتا رہتا ہے۔ ان پھولوں کی مہک سے اڑیسہ کی ادبی فضا تو معطر ہو ہی رہی ہے اب اس سے ہندوستان کے دیگر علاقے بھی مہکنے لگے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں یہ گوشہ پیش کیا جا رہا ہے' جس کے ذریعہ ان کی ادبی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہیں اس کا پتہ آپ کے تاثرات سے ہی چل سکتا ہے۔ آپ کی توجہ کا طالب۔

سید نفیس دسنوی

حمد و نعت

اختر کاظمی

Arabpur.Near Basant Talkies
Fatehpur-212601(U.P)

وجودِ عالمِ ہستی تو محض فانی ہے
بس ایک ذات خدا ہی کی جاودانی ہے
وہ ایک نور ہے، ہر شے میں ہے ظہور اس کا
کوئی شبیہہ نہیں ہے نہ اس کا ثانی ہے
تجلّیات کا تیری نہیں شمار کوئی
تری صفات کی تخصیص کس نے جانی ہے
نہیں ہے ثروت وحشمت میں وہ سکون قلبی
بس ایک ذکرِ الٰہی میں شادمانی ہے
ہماری زیست فقط عاقبت کی ہے کھیتی
جو فصل بوئیں گے کاٹیں گے ساتھ جانی ہے
ہماری آنکھوں کو پھر سے بصیر تو نے کیا
ترا یہ حسنِ عطا ہے، یہ مہربانی ہے
طویل تر ہے بہت راہِ آخرت اخترؔ
بہت قلیل سی دنیا کی زندگانی ہے

فرحت حسین خوشدلؔ

Hazaribagh(jharkhand)

نبی کی محبت مجھے تو عطا کر
مقامِ فضیلت مجھے تو عطا کر
کروں میں اطاعت ہمیشہ نبی کی
اطاعت کی قوت مجھے تو عطا کر
کروں روز قرآن کی میں تلاوت
خدایا ہدایت مجھے تو عطا کر
فدائی بنوں اہلِ بیتِ نبی کا
صحابہ کی الفت مجھے تو بعطا کر
ابو بکر کی خوبیاں کچھ مجھے دے
متاعِ صداقت مجھے تو عطا کر
ضرورت ہے دنیا کو صدیقیت کی
عمرؓ کی نیابت مجھے تو عطا کر
تری ذاتِ قدسی کا قائل ہے خوشدلؔ
نبی کی محبت مجھے تو عطا کر

ڈاکٹر محبوب راہیؔ

At/P.O:BarsiTakli.Dt:Akola-444401

در شانِ رسولِ صلِّ علیٰ جو نعت سنانے والے ہیں
حسانؓ و ابنِ رواحہؓ کے پاکیزہ گھرانے والے ہیں
وہ راہِ حق وصداقت میں سر اپنے کٹانے والے ہیں
محبوبِ خدا کاندھے پہ جنھیں خود اپنے بٹھانے والے ہیں
وہ سر کو کٹانے والے تھے، ہم سر کو جھکانے والے ہیں
وہ اور زمانے والے تھے ہم اور زمانے والے ہیں
اللہ ہمارا خالق ہے جو روزِ جزا کا مالک ہے
جس روز شفاعت پیارے نبی اپنی فرمانے والے ہیں
کیا شان ہے ان کی جرأت کی، کیا آن ہے ان کی ہمت کی
جو ساحلِ دشمن پر اپنی کشتی کو جلانے والے ہیں
اللہ رے شانِ استغنا، اللہ رے طرزِ جود و سخا
بچوں کو بھوکا سلاکر جو مہماں کو کھلانے والے ہیں
کیوں خوف ہو مجھ کو اے راہیؔ پھر راہِ حق سے بھٹکنے کا
وہ رہبرِ دین و دنیا مجھے جب راہ دکھانے والے ہیں

مختار احمد کوثرؔ

C-66, Kareli. Allahabad(U.P)

دل ابھی سے ان کا منور، سر ابھی سے جھکانے لگے ہیں
جن کا جن کا بلاوا ہے آیا وہ مدینے کو جانے لگے ہیں
ہے جو ایماں تمہارا سلامت، مت پریشان ہو عاصیو تم
سب غلامانِ احمدؐ کی خاطر حشر میں شامیانے لگے ہیں
فرش سے عرش تک کا سفر تھا، میرے آقا کا یہ معجزہ تھا
ایک لمحے کا تھا کارنامہ، عقل سمجھی زمانے لگے ہیں
ماہِ اول ربیع صبحِ صادق، روز دو شنبہ تاریخ بارہ
آمد آمد ہے خیر الوریٰ کی، عرش تک جگمگانے لگے ہیں
دے پیارے دلوں کو خدایا اپنے محبوب کا دردِ عرفاں
ہم نبی جی نبی جی ہی رٹ کر خود کو طوطے بنانے لگے ہیں
ساری دنیا تو گھوما ہے کوثرؔ وائے قسمت مدینہ نہ دیکھا
اب یہ سارے سفر بن کے طعنے دل کو میرے ستانے لگے ہیں

صابر فخرالدین

Opp:PoliceQuarters.MainRod
P.O:Yadgir-585201
Karnataka

نعتِ جنابِ سرورِ کل انبیا لکھوں
پھر دل کی یہ طلب ہے کہ صبح ومسا لکھوں
یہ فخر و انبساط و سعادت کی بات ہے
میں اپنے آپ کو جو غلام آپ کا لکھوں
جب تک مرے قلم میں ہیں لکھنے کی طاقتیں
میری یہی دعا ہے کہ صلّ علیٰ لکھوں
اللہ مدح خوانِ شہہِ دوسرا ہے جب
پھر کیوں نہ میں بھی مدحِ شہہِ دوسرا لکھوں
جن کو ملا ہے صاحبِ لولاک کا خطاب
صابرؔ کو کیوں نہ ان کے ہی در کا گدا لکھوں

حمید عکسی

H.No:14-6-39,Nizampura.Mandi
Bazar.Dist:Warangal-506002
(T.S)

ان کی چوکھٹ پر کبھی جا کر کھڑا ہو جاؤں میں
''در پہ آقا کے سراپا مدعا ہو جاؤں میں''
جس کو خوشبو کہتے ہیں وہ ہے پسینہ آپ کا
جسم پر اپنے ملوں خوشبو بھرا ہو جاؤں میں
آپ کے ناموس پر جب حرف آیے اس گھڑی
جان کی بازی لگا دوں اور فدا ہو جاؤں میں
بھیک لیتا ہے زمانہ آپ کی دہلیز سے
خود وہاں جا کر سراپا مدعا ہو جاؤں میں
کھوٹے سکے کی طرح عکسیؔ ہے میری زندگی
ان کی رحمت کی نظر ہو تو کھرا ہو جاؤں میں

حمد و نعت

ڈاکٹر مسعود جعفری

Shaikhprt.Hyderabad
Mob-9949574641

سمندروں میں کہاں ڈوب کر پکارا ہے
تری خدائی کو مانا ہے تو ہمارا ہے
تری ہی خیر منائی ہے ہم نے طوفاں میں
ترے ہی نام کا پروردگار یارا ہے
تری کتاب سے روشن رہی ہیں راہیں بھی
وہی ہے عرش کی قندیل عالم آرا ہے
ہماری آنکھ کی بینائیاں بھی شاہد ہیں
ازل سے لے کے ابد تک ترا نظارا ہے
مرے بیان کو بخشی ہے تو نے رعنائی
ترے خلوص کا دریا بھی بے کنارا ہے
نگاہیں بند کریں بھی تو تو دکھائی دے
ترا وجود تو ہر شے سے آشکارا ہے
ہوائیں تیز بھی ہو جائیں تو یقیں ہے ہمیں
رہے گا جشن چراغاں کہ تو ہمارا ہے

سید اسلم صدا الا آمری

22/23BooBganStreet.2ndLane.Mount
Raoad.Chennai-600002
Mob-9444752605

گدا ہو ہے حاصل عطائے محمدؐ — ہے عالم کا سلطاں گدائے محمدؐ
مرے دل سے سارا الم گم ہوا ہے — گھر آکر مرے مسکرائے محمدؐ
احد اک معمہ ہے در اسمِ احمدؐ — ورائے گماں ہے ادائے محمدؐ
ہوئے کل کے کل حل مسائل لحد کے — مخلل، وہاں ہوکے آیے محمدؐ
دوعالم کے والی رسولِ مکرم — ہے درکارِ عالم ولائے محمدؐ
ہے حکمِ محمدؐ ہی حکمِ الٰہی — ہے امرِ الٰہی ادائے محمدؐ
ہراک لمحہ عالم دگرگوں مرا ہے — مرا دل ہے محوِ ولائے محمدؐ
ہراک سو ہے مہکا درودوں کا موسم — ہراک سو سے آیے صدائے محمدؐ
حرم کی گلی سے صدا آرہی ہے — صدا آمری ہے گدائے محمدؐ

اے جے عالم

SkhwaGudam.P.O:KaliMandirRaod
Jharsuguda-Mob-9776031506

سبھی دکھوں کی دوا ہے پڑھو درود و سلام
اسی میں رب کی رضا ہے پڑھو درود و سلام
جہاں کی ساری پریشانیوں کا حل ہے یہی
دفاعِ ردِ بلا ہے پڑھو درود و سلام
پڑھو درود ہمیشہ رسولِ اکرم پر
یہی تو حکمِ خدا ہے پڑھو درود و سلام
وہ دشمنوں سے بھی شفقت سے پیش آتے ہیں
یہ ان کی شانِ عطا ہے پڑھو درود و سلام
یہ بات حق ہے کہ مومن کو تحفۂ ایماں
نبی کے در سے ملا ہے پڑھو درود و سلام
کرم نبی کا ہے عالم کہ نعت گوئی کا
یہ فن جو تم کو ملا ہے پڑھو درود و سلام

جمیل فاطمی

مقام وڈاکخانہ لکھمنیا۔ضلع بیگوسرائے۔851211(بہار)

آپ ختم المرسلیں ہیں، آپ ہیں پیارے نبیؐ
آپ جن و انس کی آنکھوں کے تارے ہیں نبیؐ
آپ کو بخشا خدا نے ہم کلامی کا شرف
آپ سب نبیوں سے بڑھ کر رب کے ہیں پیارے نبیؐ
دعوتِ حق ہر گھڑی دیتے رہے کفار کو
زخم کھاکر بھی نہ باطل سے کبھی ہارے نبیؐ
آپ ہی کی اقتدا میں پڑھ رہے تھے سب نماز
صف بہ صف پیچھے کھڑے تھے آپ کے سارے نبیؐ
کہتے ہیں بے حد ہے دلکش گنبدِ خضرا جمیلؔ
کاش دکھلائیں مجھے بھی اب یہ نظارے نبیؐ

قدیر احمد قدیر

LIG-ii,LE-9.NveedManzil.
KrishnaColony.HUkoti-582205
Dist-Gadak(Karnataka)

سرکار کی ولادتِ اطہر کا تذکرہ
ظلمت کدوں میں مہرِ منور کا تذکرہ
تکمیل آپ پر ہوئی اخلاق کی تمام
ملتا نہیں ہے آپ سے بہتر کا تذکرہ
سدرہ سے آگے ان کی ہیں مدحت سرائیاں
ہوگا نہ جبرئیل کے شہپر کا تذکرہ
میں خوش نصیب امتی ہوں آپ کا حضور
کرنے دیں انبیاء کو مقدر کا تذکرہ
سبطِ نبیؐ کی یاد ہمیں خوں رلائے گی
جب جب کریں گے لوگ بہتّر کا تذکرہ
تا حشر لکھ نہ پائیں گے توصیف آپؐ کی
''قطرے کریں گے کیسے سمندر کا تذکرہ''
بدرالدجیٰ کے روبرو بتلایئے قدیرؔ
کیا کہکشاں کا اور کیا خاور کا تذکرہ

ابرار نغمی

NearMommadiMasjid
Raisen-464551(m.P)

سچے پیمبر کون؟ محمدؐ جن پہ سلام
ہادی و رہبر کون؟ محمدؐ جن پہ سلام
شاہِ رسولاں، عرش کے مہماں، اقربِ یزداں
سب کے سرور کون؟ محمدؐ جن پہ سلام
نور سراپا، حسن میں یکتا، ارفع و اعلیٰ
ساقیٔ کوثر کون؟ محمدؐ جن پہ سلام
شاہِ امم ہیں، عرش قدم ہیں، فخرِ کرم ہیں
شافعِ محشر کون؟ محمدؐ جن پہ سلام

گوشۂ احباب

(مراسلہ نگار سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں)

☆ساغر ملانوی (راجستھان)

طرحی مشاعرہ میں طرحی غزل کی اشاعت پر شکریہ !شاعری کے ذریعہ زبان کی تبلیغ واشاعت کا یہ بنیادی ستون ہے یادوں کی دہلیز سے سید شکیل صاحب کی غزل دل کو چھو گئی ۔آپ کے 'ادبی گوشے' تمام کے تمام اپنے آپ میں انتخاب ہوتے ہیں۔ 'کرب آگہی کا شاعر' مضمون دل کو بار ہادعوتِ مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ ''حمد'' رب کے حضور نظم ''مشروط واپسی'' نے دل کو خوش کر دیا۔الغرض رسالہ آل اِن ون ہے۔ جہانِ ادب میں اپنی شناخت بنا چکا ہے اور مزید اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆حولدار سلیم الدین آمر (شیگاؤں)

اپریل تا جون ۲۰۱۷ء کا سہ ماہی ''ادبی محاذ'' موصول ہوا۔ دیگر تمام گوشوں کی طرح گوشۂ غلام سرور ہاشمی بھی بہت پسند آیا۔ایک باوقار رسالہ کو پوری یکسوئی اور انتھک محنت کے ساتھ قارئین تک بلا ناغہ پہنچانا اپنے آپ میں قابل ستائش بات ہے۔جس کے لیے آپ اپنی پوری ورکنگ ٹیم کے ساتھ قابل مبارک باد ہیں۔صفحہ نمبر ۱۱ر پر میری ارسال کردہ نظم ''نفس کے نام'' اصلاح کر کے آپ نے اس رسالہ میں شائع کی۔ میں تہہ دل سے آپ کا مشکور ہوں۔میرے نام کے ساتھ غالباً صابر فخر الدین صاحب کا پتہ چھپ گیا ہے۔اس کی تصحیح فرمالیں۔میرا پتہ درج ذیل ہے:

Qasre-Hafiz,AzadNagar,Alasna
Road,Po-Shegaon-442030(M.S)

☆ضیاء جعفر بنگلور (کرناٹک) ''ادبی محاذ'' جولائی تا ستمبر نظر نواز ہوا۔اس بار آپ نے گوشۂ (سبطین پروانہ کٹیہاری) خوب نکالا ہے جس میں کئی فن کاروں نے موصوف کے فن کو سراہا ہے۔آپ نے موصوف کے سوانحی اشارے تحریر کیے ہیں۔موصوف پیدائشی طور پر دونوں ٹانگوں سے معذور ہونے کے باوجود وہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوئے اور اس طرح دوسروں کے لیے مشعل راہ کی طرح ہیں۔ان کا تحریر کردہ شعر ان کی شخصیت کا ترجمان ہے۔

میں ہوں معذور یہ سب کو بتا دو۔ مذاقاً دیکھنا اچھا نہیں ہے

ڈاکٹر خان رضوان احمد نقی صاحب نے ''فن اور شخصیت میری نظر میں'' قاضی مشتاق احمد پر موصوف کی شخصیت اُن کی تحریریں اور ان کے اعزازات وانعامات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

چاند اکبر صاحب نے ''میدان طنز ومزاح کا آئیگون منظور وقار'' کی شخصیت اور فن پر گہرائی سے تجزیہ کیا ہے۔ویسے منظور وقار میرے جگری دوست ہیں۔ان کی تحریریں غضب کی ہوتی ہیں۔رؤف خیر صاحب نے ''دریافت والا شخص'' میں غضنفر اقبال کا قلمی وتحقیقی خاکہ بڑے خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے غضنفر کو نئے سرے سے دریافت کیا ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق صاحب کا افسانہ ''ٹکڑے میں بٹی میں'' ایک ایسی لڑکی کی جو جہیز کی لعنت میں پھنسی ہوئی ہے اس کے جذبات کی عکاسی نفسیاتی پہلو سے کی گئی ہے۔حنیف سید صاحب کا افسانہ ''بویا پیڑ ببول کا'' میں زلزلوں میں پاکستان اور کشمیر کے زلزلے کے قہر سے ساری دنیا ہل گئی تھی ۔وہاں منتری نے اپنی سیاست دکھائی مگر انجام برا ہوا۔افسانہ کافی طنزیہ رہا۔ شرافت حسین کا افسانہ ''رشتہ'' میں رشتوں کی اہمیت دکھائی گئی ہے۔رشتے کئی ہوتے ہیں مگر روحانی رشتے کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ قاضی مشتاق احمد صاحب نے ''محاذ اول'' میں حقیقت بیانی سے کام لیا ہے کہ انتخابی وعدے جھوٹے وعدے رہے۔ نہ سب کا وکاس ہوا اور نہ ہی سب کا ساتھ۔ ''شعری گوشے'' میں کئی شعراء نے اپنا اپنا کمال دکھایا ہے۔بہر کیف ''ادبی محاذ'' خوب سے خوب تر رہا۔

☆یاسمین تماپوری. ضلع۔یادگیر (کرناٹک)

بزرگ شاعر جناب صابر فخر الدین (یادگیر کرناٹک) کے ذریعہ آپ کا رسالہ ملا۔اس قدر عمدہ اور شاندار مشمولات نے مجھے حیران کر دیا کہ اب تک یہ میری دسترس سے باہر کیسے رہا۔ میں زرِ سالانہ ارسال کر رہی ہوں ادبی محاذ میرے نام جاری کریں تو نوازش ہوگی۔

☆انیس اظہر (وانمباڑی) آپ کا ارسال کردہ رسالہ جولائی تا ستمبر 17ء موصول ہوا۔یاد فرمائی کا دلی شکریہ! تازہ شمارہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا اور اطمینان حاصل ہوا۔ میں آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں اللہ آپ کو سعادت آمیز توفیق دے۔آپ لوگ اسی خیر خوبی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں۔

رسالہ کو خوبصورتی سے سجانے کے لئے آپ نے بہت محنت اور کامیاب کوشش کی ہے۔سچ ہے اگر مدیر باصلاحیت اور ادب دوست ہو تو کسی بھی رسالے کو نئی زندگی مل جاتی ہے۔آپ جس خلوص،محنت اور حوصلے سے رسالہ شائع کر رہے ہیں یہ کسی جہاد سے کم نہیں ہے۔اللہ کرے آپ ہر حال میں ثابت قدم رہیں۔آپ کے رسالے کے سبھی مضامین،غزلیات،افسانے اور تبصرے کاغذ پر بڑے سلیقے سے سجائے گئے ہیں۔ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا رسالہ دور جدید میں شائع ہونے والے اردو کے کسی بھی رسالے سے کم نہیں ہے۔رسالہ کا زرِتعاون M.O کر چکا ہوں۔رقم ملتے ہی سالانہ خریداری میں شامل فرمالیں۔رسالہ ادبی محاذ میرے نام جاری رکھیں۔

☆ساغر ملانوی (راجستھان) میرا محبوب رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی جانب مائل ہے۔ادب کے تمام مورچوں پر یعنی ادب کے ہر محاذ پر فاتح ہوا ہے۔

مشمولات میں چاہے نثر کا حصہ ہو یا نظم کا حصہ یا پھر 'گوشے' اور 'افسانے' ہر قاری کو دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔

خاکسار مندرجہ ذیل ایک مشورہ دینے کی جرأت و جسارت کر رہا ہے۔ محبوب رسالے میں سبھی اصناف میں کچھ نہ کچھ دیکھنے کو ملتا ہے اور نہیں ملتا ہے وہ ہے 'ڈراما'۔ ایسا نہ ہو کہ یہ صنف دنیا سے مٹ جائے۔ یہ سلسلہ قسط در قسط ہی سہی شروع ضرور کیا جائے۔

☆شارق عدیل (ایٹہ)

''ادبی محاذ'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ اور یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے کہ سبطین پروانہ صاحب کے فکر و فن کے تعلق سے لوگوں نے محبت سے لکھا ہے۔ اور بہت سی کام کی باتیں ان کے شعری حوالے سے مضامین میں رقم کی ہیں جو مستقبل میں ان کے کام آنے والی ہیں۔

''محاذ اول'' محترم قاضی مشتاق صاحب کی بے باک نڈر شخصیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ اور اس دور کی خوف گزیدہ ذہنیت سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ محترم قاضی مشتاق صاحب سچائی کو بیان کرتے ہوئے مصلحت کی آڑ میں چھپنا قطعی پسند نہیں کرتے ہیں اور یہ حوصلہ ہر کسی میں نہیں ہوتا ہے۔

اس لیے ان کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ آپ ''ادبی محاذ'' کو بہت ہی علمی انداز میں ترتیب دیتے ہیں کیونکہ گوشے کی موجودگی میں بھی عام شمارہ پوری طرح زندہ نظر آتا ہے ورنہ عام شمارے پر گوشہ غالب آجاتا ہے اور قاری عام شمارے کے ادبی وقار کو ڈھونڈتا ہوا رہ جاتا ہے۔ طرحی نشست کا سلسلہ اس وقت بہترین اور وقت کی ضرورت کے مطابق ہے۔ کیونکہ ماضی میں طرحی نشستوں نے ہی شعری تربیت کی تاریخ لکھی ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے مگر اس دور کے شعری اساتذہ کی آنکھوں میں خوش فہمیوں کا سرمہ لگا ہوا ہے۔ اس لیے وہ لوگوں میں شعری ذوق کو مرتا ہوا دیکھ ہی نہیں پا رہے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا جو طرحی نشست کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تبصرے سبھی عمدہ ہیں۔

☆اختر شاہجہاں پوری (یوپی)۔ ''ادبی محاذ'' کا تازہ شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۱۷ء باصرہ نواز و بصیرت افروز ہوا۔ سعید رحمانی کی ماہرانہ قیادت اور آپ کی پُر خلوص رفاقت نے رسالے کو قارئین کا پسندیدہ رسالہ بنا دیا ہے اگر یہ کہا جائے کہ قارئین اس کے منتظر رہتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اس مرتبہ گوشۂ سبطین پروانہ کیٹہاری شامل ہے۔ ان کے فن پر اہل قلم نے روشنی ڈالی ہے اس سے ان کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ آپ کو یہ معلوم ہو کر خوشی ہوگی کہ ہمارے شعری مجموعہ ''تکمیل'' کو بہار اردو اکیڈمی نے پہلا انعام اکیس ہزار روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔

(نوٹ۔ انعام سے نوازے جانے پر ادارہ آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے)

☆سید اسلم صدا الامین (چینئی)۔ ''ادبی محاذ'' جولائی تا ستمبر ۲۰۱۷ء گوشۂ سبطین پروانہ کیٹہاری نظر نواز ہوا۔ قاضی مشتاق احمد صاحب نے ملک کی موجودہ حالات کا محاسبہ بڑی بے باکی سے کیا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ''محاذ ثانی'' میں آپ نے صنف غزل اور اس کے فنی لوازمات میں موجود ایطائے جلی و خفی کے مختلف پہلوؤں کا اختصار سے جو مکمل جائزہ لیا ہے قارئین کے لیے لائق استفادہ ہے۔ اس کے علاوہ سبطین پروانہ کی جس نعت یعنی ''رحمتِ عالم نے اچھا کہہ دیا تو ہو گیا'' کو موضوع بحث بنا کر ایک مختصر اور جامع مضمون ترتیب دیا ہے۔ اس میں پروانہ کو بعض مفید مشورے بھی دیے ہیں۔

☆جمیل فاطمی (لکھمیا): ۱۷ر جولائی کو اپنے گاؤں سے واپس آیا تو ادبی محاذ کے تازہ شمارے کو اپنا منتظر پایا۔ اس میں اپنی نعتِ پاک اور غزل شامل دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ آپ حضرات کا ممنون ہوں۔ اس بار آپ نے سبطین پروانہ کا گوشہ شایع کیا ہے۔ مضامین سے ان کے بارے میں جاننے کا موقع ملا۔ ایک باہمت معذور شخص جو باضابطہ اپنی محنت اور لگن سے اپنے خاندان کی کفالت بھی کر رہا ہے اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے زلفِ شاعری کی شانہ پذیری بھی کر رہا ہے' اس کی ہمت اور خودداری کا کیا کہنا؟ بہت کم وقت میں سبطین پروانہ نے جو شعری صلاحیت حاصل کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ مضمون نگاروں نے ان کی کاوشوں کا کامیاب تجزیہ کیا ہے۔ دیگر مشمولات بھی لائقِ مطالعہ ہیں۔ گزشتہ شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی لائقِ ستائش ہے۔ مبارکباد قبول فرمائیں۔

☆ابرار نغمی (رائسین 'ایم۔ پی) اس میں کوئی شک نہیں کہ ''ادبی محاذ'' شعر و ادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان ہے۔

☆ابرار نغمی (رائسین 'ایم۔ پی) اس میں کوئی شک نہیں کہ ''ادبی محاذ'' شعر و ادب کی صالح قدروں اور عصری رجحانات کا ترجمان ہے اور آئینہ دار ہے۔ گوشۂ سبطین پروانہ مبسوط اور جامع ہے۔ صاحبِ گوشہ پر مشاہیر ادب نے وقیع و معیاری مضامین میں اُن کے ادب میں مقام متعین کرنے میں یقیناً معاون ممدو ثابت ہوئے۔ گوشے کے علاوہ نثر میں فکر انگیز مضامین دعوتِ مطالعہ دیتے ہیں۔ خان رضوان اور فاروق ارگلی کے مضامین پر دو قلم کاروں کے گہرے ادبی مطالعہ کے غماز ہیں۔ غلام ربانی آیاز نے منظر اعجاز کے کلام پر عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ رؤف خوشتر کا خاکہ بھی پڑھ کر اچھا محسوس ہوا۔ افسانے تینوں اچھے ہیں۔ افسانہ نگاروں کی زبان و بیان پر دسترس کا پتہ دیتے ہیں۔

حصۂ نظم میں ڈاکٹر علی عباس امید اور شارق عدیل کی نظموں نے جو گہرا تاثر دیا ہے وہ دل و دماغ سے جلد محو نہیں ہوتا۔ تقریباً سبھی غزلوں میں دو سے تین اشعار دل پذیر اور متاثر کن ہیں۔ صابر ادیب کی غزل آج کے فلاکت زدہ انسان کے رنج و غم اور مسائل سے دوچار' زندگی کی ترجمان ہے۔ گہری عصری حسیت کی حامل ہے۔ چھوٹی بحر میں صابر فخر الدین اور امجد سلیم امجد نے اچھے اشعار نکالے ہیں۔ ڈاکٹر مسعود جعفری کی غزل ہمیشہ کی طرح مختلف رنگوں کی کہکشاں کی طرح چمکتی ہے۔ مجموعی طور سے شمارہ معیاری و فکر انگیز تخلیقات سے مزین ہے۔ یہ آپ کی اردو زبان سے گہری وابستگی اور نفیس دسنوی صاحب کی مدیرانہ صلاحیت کا ثمرہ ہے۔

وجے ارون صاحب آج کے شعری منظر نامہ میں اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔جس میں جمالیات کے ساتھ ساتھ عصری حسیت بھی پائی جاتی ہے۔غزل کے تعلق سے ان کا خیال ہے کہ غزل کی تعریف ''سخن از زناں گفتن''، نہیں رہی۔اب اس کا دامن اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اس میں انفس وآفاق کے سبھی پہلوؤں کو سمویا جاسکتا ہے۔ان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔آج کی غزل زلف ورخسار کی باتوں تک محدود نہ رہ کر کربِ ذات سے کربِ کائنات تک کو اپنے اندر سمونے لگی ہے۔اس کا اندازہ آپ ان کی غزلوں کے مطالعہ سے کرسکتے ہیں۔سیدھے سادے لفظوں میں یہ غزلیں گہرائی وگیرائی کی حامل ہیں۔

ان کا آبائی وطن ہوشیار پور، پنجاب ہے جہاں اردو تعلیم انھوں نے چھٹی جماعت تک حاصل کی۔پانچ سال کی عمر سے شاعری کا ذوق پیدا ہوگیا تھا جو دہلی اور نیروبی (افریقہ) میں قیام کے دوران شعر گوئی کا ذریعہ بنا۔نیروبی میں علامہ کالیداس گپتا رضا قیام فرما تھے۔انھیں کی رہبری میں ان کی شاعری پروان چڑھی جواب برگ وبار لاکر تناور شجر بن چکی ہے۔

رابطہ۔ Rou House No-28.Anand Park. Oppo:Udiksha.Naigaon Taluka:Vasai Dist:Thane-401208

مہمان شاعر

وجے ارون

اس کالم میں شمولیت کے لیے مختصر سوانحی خاکہ، پانچ غزلیں اور تصویر ارسال کریں۔مزید تفصیلات کے لئے اس نمبر پر رابطہ کریں:09437067585(ادارہ)

1

حسین آنکھوں کی بات ہو یا حسیں لبوں کی وہ سب غزل ہے
غزل محبت کی داستاں ہے، کہ دل کے کہنے کا ڈھب غزل ہے

غزل کی تعریف اب نہیں ہے، کہ ہو ''سخن از زنان گفتن''
سمائے اس میں ہر ایک مضموں، بہت وسیع ہے جواب غزل ہے

غزل ہو مختصر کہ جامع، مگر ہر اک شعر ہو نگینہ
کہ سنتے ہی دل میں بیٹھ جائے، اگر ہوا ایسا تو تب غزل ہے

جہان بھر میں ہر ایک قائل، اگر ہے اب اردو شاعری کا
تو اس کے بارے میں سچ یہی ہے، کہ اِس کا واحد سبب غزل ہے

قطعہ ہو وہ نظم یا رباعی، وہ گیت ہو یا دوہا چوپائی
یہ سب ہیں پیغمبرانِ شعری، مگر ارون جو ہے رب غزل ہے

2

نکلے اعمال بھی آخر میرے
میرے ہی اپنے ہوئے پھر میرے

میں ہی تنہا سرِ منزل پہنچا
پیش رو تھے نہ متاخر میرے

میرا دل ہی مرا آئینہ ہے
عیب کرتا ہے وہ ظاہر میرے

پیار کے بدلے تجھے چاہیے پیار
تیرا کیا کہنا اے تاجر میرے!

تیرا سر ہوگا ارون سر بہ فلک
میرے قدموں پہ کبھی گر میرے

3

یہ دنیا ہے فریبی، چل سکوگے
نیے سانچوں میں پل پل ڈھل سکوگے

بتاؤ چاند سے اے خوبصورت
زمیں پر ساتھ میرے چل سکوگے

رہوگے جو کلی بن کر چمن میں
تو پھر کانٹوں میں بھی تم پل سکوگے

اجالا آگ دونوں چاہتا ہے
کہو کیا تم دیے سا جل سکوگے

ارون کہتے ہو مٹی سے جڑے ہو
یہ مٹی اپنے منہ پر مل سکوگے

4

وہ خدا ہے تو وہ نایاب نہیں ہوسکتا
ہر جگہ ہے وہی کمیاب نہیں ہوسکتا

ہے حقیقت تو حقیقت، ہے اگر خواب تو خواب
وہ حقیقت ہے تو پھر خواب نہیں ہوسکتا

ناخدا اور خدا دونوں سنبھالیں جس کو
وہ سفینہ کبھی غرقاب نہیں ہوسکتا

ہر بھنور سے ہے بڑا سوچ سمندر کا جہاز
یہ سفینہ تہہِ گرداب نہیں ہوسکتا

لاکھ احباب کریں دشمنی مجھ سے اے ارون
پھر بھی میں دشمنِ احباب نہیں ہوسکتا

5

لاکھ لاکھوں سے دوستی بھی ہو
پھر بھی کچھ اک سے دشمنی بھی ہو

آدمی غم کو بھول جاتا ہے
بعد غم کے اگر خوشی بھی ہو

زندگی پر تو بات کرلوں میں
زندگی میری، زندگی بھی ہو

پھول ہو یا خیال، پر اس میں
عمدگی ہو تو تازگی بھی ہو

دل ہو پتھر کا، پھر بھی اس کے ساتھ
آنکھ منصف کی شبنمی بھی ہو

مت اچھالو اسے، اسے ہی کہو
آدمی میں اگر کمی بھی ہو

گاؤں میں لمپ پوسٹ لگ تو گیے
خوب ان میں روشنی بھی ہو

منظومات

ناوک حمزہ پوری
دارالادب۔حمزہ پور۔شیر گھاٹی۔گیا

رباعیات

آج کا سچ

یہ آج کا سچ ہے نہیں مجذوب کی بڑ
وہ شہر کی سڑکیں ہوں کہ جنگل بیہڑ
فعال ہے ظلمت شب تار میں بھی
اس دور کا انسان ہے یا چمگادڑ

کھلاڑ

ہر چند کہ یہ شہر ہے جنگل نہ پہاڑ
جاری ہے ادھر چھیڑ تو اس جانب چھاڑ
آوارگی ہر سمت ہوئی ہے یوں عام
لوگوں کی نظر میں ہے ہر اک نار کھلاڑ

تعمیر مشکل نہیں

حالات کو تعمیر کی جانب بھی موڑ
کچھ کر بھئی، خاموش نہ رہ چپی توڑ
مشکل نہیں دیوار عمل کی تعمیر
اٹھ جا تو سہی اینٹ پہ اک اینٹ تو جوڑ

اب ٹوپی پہننا بھی گناہ ہے

حالات بدل جاتے ہیں کیسے دھڑ دھڑ
یا شہر ہو یا ہو کوئی جنگل بیہڑ
بس اتنا کہ ہے کیوں کوئی ٹوپی پہنے
کرتے ہیں اسے قتل مچا کر ہلڑ

عبدالمجید فیضی سمبلپوری
12/106,Nayapara,sambalpur
Mob:9778291038

حب الوطن

اے وطن، پیارے وطن، تجھ پہ قرباں جان وتن
جانِ ایماں ہے مری، جذبۂ حبِ وطن
اے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ قرباں جان وتن

جانِ جاں ہندوستاں، خوش نما جنت نشاں
تیری رنگا رنگی پر، رشک کرتا ہے جہاں
اے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ قرباں جان وتن

ہندو، مسلم، جین، بودھ، ہوں مسیحی یا یہود
سب کا ہندوستاں وطن، سب کا ہے یاں ہست وبود
اے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ قرباں جان وتن

ہے یہ بھارت کا سماج، ہے یہاں جنتا کا راج
سب کے سب آزاد ہیں، اب نہیں ہے تخت وتاج
اے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ قرباں جان وتن

ایکتا کا یہ چلن، ورثۂ گنگ و جمن
ہے ہمالہ بھی سدا، صد چمن اندر چمن
اے وطن، پیارے وطن! تجھ پہ قرباں جان وتن

ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی
Malngua.Nepal.Mob-8229055737

ثلاثیاں

وہ اگر اک نظر نہیں بھاتی
جب چلی جائے روٹھ کر میکے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کوئی نہ آس پاس رہتا تھا
ساری جنت میں ایک میں تنہا
اس لئے میں اُداس رہتا تھا

ہر ورق زندگی کا سادہ ہے
ابن آدم ہو کہ بنت حوا
ایک دوجے بغیر آدھا ہے

کوئی خالق ترے سوا تو نہیں
اپنی فریاد! بتا کس سے کریں؟
دوسرا اور کوئی خدا تو نہیں

ڈاکٹر علی عباس امید
StarResidency.Idgah Hills,Bhopal-462001

پت جھڑ کی نظم

گھٹے گھٹے سے در وبام اونگھتی گلیاں
خرد کی راہ گزر پہ جنوں کا سیل رواں
مہیب وقت کے پہلو میں آرزو حیراں
دیارِ حیات پہ یکسر ہجوم تشنہ رواں
ہر اک سانس مسلط ہے مثل کوہِ گراں
ہر اک خیال رَسَن بستۂ آبرو عریاں
کہیں پہ معرکۂ جاں کہیں پہ سوزِ نہاں
خود اپنے خون میں لتھڑے ہر ایک پل کے نشاں
ہر ایک روح کے مرقد پہ زیست نوحہ کناں

ہر ایک پھول فسردہ کلی کلی لرزاں
لطیف خواب کی آنکھوں سے دل کا کرب عیاں
امید مہر بہ لب، چشمِ آگہی گریاں
نگار کیف کی زینت ہے گریۂ پنہاں
اسیر حلقۂ دہشت ہر اک عروس زباں
دیارِ حسن میں ہر سو بجائے شعلہ دھواں
وفا کی شمع پہ حاوی ہے تیرگی کا سماں
رہِ سکون سے بھٹکے ہوئے سبھی انساں
بہار پھیر گئی ہے چمن پہ رنگِ خزاں

سلیم انصاری
HIG-3,anand nagar,adhartal
Jabalpur-482004(r(M.P)

رہائی

میرے آزر مجھے دریافت بھی کر
قید پتھر میں ہوں جانے کب سے
اپنی پہچان کی امید میں روشن ہوں
بدن۔بھر
میرے اطراف سیاہی کا گھنا جنگل ہے
منتظر ہوں میں ترا
اپنے خدوخال کے ساتھ
میرے آزر،مرے محسن،مرے دوست
یہ مرے جسم سے لپٹے ہیں
جو کچھ غیر ضروری پتھر
وہ ہٹا کر۔اک دن
مجھ کو اس قیدِ مسلسل کے عذابوں سے نکال
اور عطا کر مجھے
میرے خدوخال
ہو سکے تو مرے اظہار کی امید کو روشن کر دے
میرے آزر،مرے محسن،مرے دوست
منتظر ہوں میں ترے دستِ ہنر کا کب سے

روی سنگھ رانا شاہیںؔ (ایڈوکیٹ)
Near Chowk Mandi,H-P-175008

ایک نظم

تم نے خود کو لپیٹ رکھا ہے
کچھ اندھیروں میں کچھ جنجالوں میں
تم کو رغبت ہے ان اندھیروں سے
اپنی مایوسیوں پہ نازاں ہو
تم کو اپنا جہاں، گو کتنا
سمٹا، افسردہ، چاہے چھوٹا ہو
اچھا لگتا ہے، اس لئے شاید
چُھپے رہتے ہو اپنے پنکھوں میں
گم صمی راس آ گئی ہے تمھیں
اپنی تنہائی پہ اٹھلاتے ہو
کیوں سمٹ کے رہ گئے ہو پردوں میں
خود کو بھی بھول چکے ہو شاید
اِک ذرا پنکھ پھڑ پھڑاؤ تو
باہر آؤ ذرا اندھیروں سے
چادریں پھینک دو اُداسی کی
اپنی غفلت کو خیر باد کہو
دیکھو پھر کتنا خوب رو ہے جہاں
زندگی کتنی معنی خیز بھی ہے
پیڑ، پودے، پہاڑ دریا، پھول
ایک منتر تمھیں دے جائیں گے

ابرار نغمی
NearMohmdiMasjid-Raisen-464551

خرامِ حسن

جوان ہونٹوں کی گرم لذت
شراب خانے کا جیسے پیکر
میں پی تو لوں ان لبوں کے ساغر
غمِ زمانہ ذرا سی مہلت

وہ نا شُنیدہ سا اک فسانہ
جھکی جھکی سُرمگیں نظر میں
رُکے جہاں بھی وہ رہ گزر میں
ٹھہر گیا ہے وہیں زمانہ

بکھر گئی ہے جو زلفِ برہم
فلک کی مشعل جلی نہیں ہے
کہیں بھی کچھ روشنی نہیں ہے
فضائے شب ہے محیط عالم

وہ احتیاط جمال پیکر
سبک سبک کچھ قدم چلے ہیں
چراغِ نقش قدم جلے ہیں
نظر میں کتنے سوال لے کر

خواب میرے بکھر نہ جائیں
خیال رکھنا اے تیز جھونکو
نقاب رُخ پر ہے اُن کے دیکھو
بخیر خوبی گزر نہ جایے

گوشۂ صلاح الدین تسکینؔ

سوانحی اشارے

اصل نام	:محمد صلاح الدین
تخلص	:تسکینؔ
قلمی نام	:صلاح الدین تسکینؔ
تاریخِ ولادت	:۱۸/ مارچ ۱۹۵۶ء
مقامِ پیدائش	:تارا کوٹ ۔ضلع جاجپور (اڈیشا)
ولدیت	:جناب محمد نثار الدین قادری (مرحوم)
تعلیم	:میٹرک، ہندی رتن
ملازمت:	:ریٹائرڈ آفیس اسسٹنٹ
آغازِ شاعری	:طالب علمی کے زمانے سے
اشاعت	:مختلف اخبار اور رسائل میں کلام شایع ہوتا رہتا ہے
گھر جنت	:بدر النساء شریکِ حیات
اولاد	:لڑکے۔محمد فیاض الدین، محمد نیاز الدین اور محمد صدام حسین
	:لڑکیاں۔عائشہ پروین، شہناز پروین اور ناہیدہ پروین
مشغلہ	:شعر وشاعری اور مطالعہ
اداروں سے وابستگی	:فیضانِ ادب، کٹک
تصنیف	:باغِ تصور (شعری مجموعہ) ۲۰۱۵ء
رابطہ	:صلاح الدین ۔مائیکالین۔اڑیا بازار کٹک ۔753001 (اڈیشا)
موبائل	09861454529:

مختصر تعارف

تصور کے باغ میں رنگ برنگی پھول کھلانے والے صلاح الدین تسکینؔ جب اس مہکتی فضا سے نکل کر آج کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو جدید انسان کا کرب اور ساتھ ہی آج کے سلگتے ہوئے مسائل دیکھ کر مضطرب ہو اٹھتے ہیں۔ایسے میں ان کا قلم جمالیات کی راہوں سے ہٹ کر مسائل کی کھردری رہ گزر پر چل پڑتا ہے۔انہدام پذیر معاشرے میں قدروں کی شکست وریخت اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی سطح پر پائی جانے والی پستی، تعصب، نفرت، دنگے، فسادات، انسانیت سوزی اور رشتوں کی پائمالی ان کا موضوع سخن، بن جاتی ہے اور وہ ان بدعنوانیوں پر بڑی بے باکی سے اس طرح نشتر زنی کرتے ہیں۔

جہالت کو ملا کرتی ہے گدی اب چناؤ میں۔شرافت کا امیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے

بہاتا ہے لہو جو دیش میں معصوم لوگوں کا۔اسی کو لوگ اپنی قوم کا سردار کرتے ہیں

بقول پروفیسر سید منظور احمد قاسمی ''آپ کی شاعری میں داخلیت بھی ہے اور عصری حسیت بھی۔غزلیہ شاعری کے میدان میں بہت خوش رنگ پھول بکھیرتے ہیں۔اڈیشا کی اردو شاعری پر موصوف کا ہمیشہ احسان رہے گا''۔

مجموعی طور پر ان کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں جمالیاتی کیف وکم کے ساتھ آج کے سلگتے ہوئے مسائل عکس ریز ہیں۔ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف بیشتر مشاہیر ادب کر چکے ہیں مگر وہ ابھی بھی مطمئن نہیں ہیں اور بہتر سے بہتر کی جستجو میں سرگرم سفر ہیں۔انھیں امید ہے کہ اپنی منزل کو پالیں گے۔اس لیے کہتے ہیں:

اشعار ٹوٹے پھوٹے کہتا ہوں آج تسکیںؔ
میری غزل بھی ہوگی روشن مثال اک دن

اس شمارے میں ان کا گوشہ شامل ہے۔ان کے فکر وفن کا جائزہ مختلف قلمکاروں نے بڑی گہرائی سے لیا ہے جس کے ذریعہ صلاح الدین تسکینؔ کی شاعری کے مختلف گوشے روشن ہوئے ہیں۔ان کے مطالعہ کے بعد امید ہے کہ قارئین اپنے تاثرات سے ضرور نوازیں گے۔جن معزز قلمکاروں نے مضامین لکھنے کی زحمت گوارا کی ادارہ ان کا ممنونِ احسان رہے گا۔

سید نفیس دسنوی

فن اور شخصیت

عبد المتین جامیؔ
اردو بازار۔ پوسٹ پدم پور
ضلع کٹک۔۷۵۴۲۰۰ (اڈیشا)

صلاح الدین تسکینؔ کا شعری رویہ

۱۹۸۰ء کے بعد جس نئی شاعری نے جنم لیا اس کو مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کیا گیا۔ بے شک اس نئی شاعری میں کچھ نئی باتیں پائی گئیں۔ حالانکہ جدید شاعری میں یہ باتیں مفقود تھیں لیکن اس کے ابتدائی جراثیم کسی نہ کسی حد تک اس میں پائے جاتے تھے۔ میرے اس قول کی توثیق حامدی کاشمیری کے ذیل کے جملوں سے ہوتی ہے کہ: ”وقت گزرتا ہے تو کئی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور نتیجے میں اہلِ فکر و دانش اور ادبا و شعرا غیر محسوس طریقے سے ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ جدیدیت کی پیدا کردہ ذہنی کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہی اور مابعد جدیدیت ایک نئے فکری رویئے کے طور پر سامنے آئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جدیدیت طے کردہ نظریات کی نفی کرنے کے باوجود گم شدگی اور بے گانگی کی نظریاتی ادعائیت کی شکار ہونے لگی۔ مزید یہ کہ وہ فن پارے کو قائم بالذات قرار دے کر اس کی ثقافتی اور معاشرتی رشتگی سے نظر انداز کرتی رہی اور بے فیض ہیئتی تجزیہ نگاری کو اہمیت دیتی رہی۔ مابعد جدیدیت، جدیدیت کے خلاف حالات کی خرابیٔ بسیار کے باوجود جامعیت یعنی اس کے تاریک پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے روشن پہلوؤں نیز اس کی جنسی، جمالیاتی اور تخلیقی مطالبوں کا احترام کرتی ہے......مابعد جدیدیت اپنی تجرباتی فرضیت اور جذب کا سامنا کرنے کی ترغیب دیتی ہے“۔ (میرا نظریۂ شعر۔ حامدی کاشمیری بحوالہ ”شیرازہ“ حامدی کاشمیری نمبر)

مندرجۂ بالا حامدی کاشمیری صاحب کے حوالے سے جو کچھ کہا گیا سو فی صد صحیح ہونے کے باوجود ہیچ مداں کے خیال میں ہر دور میں کئی طرح کے رجحانات پنپتے رہے ہیں۔ اکیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہندوستان کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں دلت لٹریچر اور احتجاجی لب ولہجہ کی داغ بیل پڑی۔ اس طرح کی شاعری کا رنگ وآہنگ اس سے قبل کی شاعری سے جداگانہ ہے۔ موجودہ عہد میں پنپنے والے اس رجحان کو مابعد جدید کے نام سے ہرگز موسوم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی پہلے کے طے شدہ تنقیدی اصول کی مدد سے اس پر تنقید کی جا سکتی ہے۔

بہر کیف ان مباحث سے ہٹ کر ناچیز کو صوبۂ اڑیسہ میں ۱۹۶۰ء کے بعد کی جانے والی شاعری کی طرف لوٹنے کی اجازت دیجئے۔ ۱۹۶۰ء کے پہلے اڑیسہ میں شاعری کا حاوی رجحان وہی روایتی رومانی شاعری ہی کے ارد گرد گھومتا تھا۔ مظہر امام صاحب آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے جب کٹک تشریف لائے تو گویا ان کے ساتھ ہی اردو شاعری میں جدیدیت بھی در آئی۔ کچھ شعرا نے ان سے متاثر ہو کر جدیدیت کی طرف پیش قدمی کی تو کچھ پرانے شعرا کی بتائی راہ پر ہی گامزن رہے یعنی روایتی رومانی شاعری کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہے۔ اس طرح اس عہد میں بھی دونوں رجحانات پوری آب وتاب کے ساتھ پنپتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلہ ۱۹۸۰ء تک جاری رہا۔ لیکن تب تک جدیدیت کا تجرباتی دور گزر چکا تھا۔ الفاظ کی شکست وریخت سے گریز کرتے ہوئے جو نئی آوز ساری دنیا میں ابھرنے لگی تھی اڑیسہ میں بھی اس کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ جدیدیوں کی ایک نئی کھیپ پورے طور پر کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ لیکن اس دور میں بھی روایتی رومانیت کی گونج یہاں کے شاعروں میں سنائی دیتی رہی۔ کبھی کبھی چاشنی بدلنے کے لیے ہی شاید کچھ کچھ شعرا کبھی کبھی جدید حسیت سے واقفیت کی پہچان دینے لگے۔ ایسے ہی شعرا میں صلاح الدین تسکینؔ کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے روایتی شاعری سے اپنا رشتہ جوڑے رکھا۔ کبھی کبھی ان کی شاعری میں جدید حسیت جھانک جاتی تھی۔ علاوہ ازیں کہیں کہیں تغزل کے ساتھ ساتھ زمانے کی روش سے شکایت، زمانے سے فریب خوردگی، تنہائی کا احساس، احساسِ محرومی، رہنماؤں کی سیاسی بازی گری کی شکایت وغیرہ ہر طرح کی بات ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ تاہم ان کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں رومانیت کو حاوی رکھنا چاہتے ہیں۔ ناچیز کا خیال ہے کہ صلاح الدین تسکینؔ دراصل رومانی شاعر ہی ہیں لیکن عہدِ جدید کی تمام ناہمواریاں ان کی اپنی بے لوث رومانی طبیعت کو بغاوت پر اکساتی رہتی ہیں۔ ان کے چند رومانی یا تغزل سے پر اشعار درج ذیل کر رہا ہوں:

یہ بھی تو میرے عشق کا ادنیٰ کمال ہے۔ دیکھا ہے اس کا جلوہ جدھر دیکھتا رہا
جب بھی آتی ہے یاد ماضی کی۔ اس سے ملنے کو ٹھہر جاتا ہوں
دے رہا ہوں اپنا دل اس کو جو چاہے وہ کرے۔ ہنس کے دل کو توڑ دینا اس کی عادت ہے تو ہے
دیارِ عشق کی تسکینؔ یہی روایت ہے۔ یہاں چراغ نہیں دل جلائے جاتے ہیں
زندگی آج ہر اک رنج والم سے ہٹ کر۔ جو ترے ساتھ گزارے تھے وہی پل مانگے
تمام دن تو بڑی بے کلی میں بیت گیا۔ پھر ان کی زلف کے سائے میں شام کیا کرتے
ہم تو دیتے رہے دنیا کو محبت کا پیام۔ درمیاں اپنے یہ شمشیر کہاں سے آئی

اوپر حوالے کے بطور لکھے گیے اشعار کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔لیکن اس مجموعے میں چند ایسے رومانی اشعار بھی ہیں جن میں سطحی خیال کو پرونے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً:

کس نے اڑائے ہوش ہمارے نہ پوچھیے۔ کتنے حسین تھے وہ نظارے نہ پوچھئے
اک روپ سمایا ہے جس دن سے خیالوں میں۔ ہر دن ہے حسیں میرا ہر رات سہانی ہے
کھنکتی کانچ کی چوڑی جو پہنے گاؤں کی گوری۔تو اس کے سامنے سونے کا کنگن ہار جاتا ہے

مندرجۂ بالا رومانی اشعار کے علاوہ موصوف کے اس مجموعے میں جدید حسیت سے پر کچھ ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جن سے ان کی اپنی پہچان بنتی ہے۔موصوف کے ان اشعار میں احساسِ محرومی،ہم وطن مذاہب کے دیگر افراد سے شکایت،نئی تہذیب سے خطرہ،معاشرتی بے راہ روی،زمانے سے فریب خوردگی،احساسِ تنہائی وغیرہ ہر طرح کی جدید حسیت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

کہیں کہیں اکیسویں صدی کا حاوی رجحان یعنی احتجاجی لب و لہجہ بھی ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔احساسِ محرومی کا اظہار موصوف کے ان اشعار سے ہو جاتا ہے:۔

آگے کی سمت بڑھ گیا لوگوں کا کارواں۔ پیچھے سے میں ہی گردِ سفر دیکھتا رہا
میں جس کے ساتھ چلا جاؤں اپنی منزل تک۔ مرے نصیب میں وہ قافلہ نہیں آیا

مابعد جدید دور کا یہ ایک المیہ یہ بھی ہے کہ بھائیوں اور دوستوں پر بھی اعتماد نہیں رہا۔وہ دور گزر گیا جب دوست کے لیے اور بھائی بھائی کے لیے اپنی جان دے دیتا تھا۔اب تو بس نفسی نفسی کا عالم ہے یعنی روزِ محشر کے نظارے اپنے ہی دور میں نظر آنے لگے ہیں۔موصوف کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کرتے ہیں ساز باز مرے دشمنوں سے وہ۔ جن کو سمجھ رہا تھا کہ وہ بھائیوں میں ہیں
مرا رفیق مجھے لے چلا ہے جس جانب۔ وہ راستہ مجھے لگتا ہے قتل گاہ کا ہے
نہ جانے کب کسی کے ہاتھ میں خنجر نکل آئے۔ہم اپنے دوستوں کے بیچ بھی ہشیار رہتے ہیں

اسی طرح نئی تہذیب کے تئیں شاعر کے دل میں جو خدشہ ابھر آیا ہے وہ صرف اسی کا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے اہلِ ایمان نیز اہلِ فکر کا خدشہ ہے۔مثلاً:۔

نئی تہذیب کا چلنے لگا جادو سب پر۔اب سلامت رہے ایمان بہت مشکل ہے

ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ اس کے ہم وطن بھائیوں نے جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے تئیں شاعر کی شکایت قابلِ غور ہے کہ:

کہتے ہیں وہ چمن پہ ہمارا نہیں ہے حق۔ہم جس کے باغباں تھے ابھی کل کی بات ہے
اب تو غبارِ راہ سے کم تر ہے زندگی۔ہم میرِ کارواں تھے ابھی کل کی بات ہے

مندرجۂ بالا دونوں اشعار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کچھ ہماری نااہلی اور کچھ غیروں کا متعصّبانہ رویہ ہی ہماری اس حالت کے لیے ذمہ دار ہے۔

عہدِ جدید نے ہر جدید انسان کو اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ اس المیے کے ساتھ ساتھ وہ کسبِ معاش کے چکر میں پڑ کر عدیم الفرصتی کا شکار ہو گیا ہے۔نوجوان طبقوں کے اندر بے کاری اور بے روزگاری کی شکایت بھی پائی جاتی ہے۔اس بات کو ذرا طنزیہ لہجے میں شاعر کہتا ہے:۔

ہمیں فرصت کا لمحہ ایک پل ملتا نہیں لیکن۔وہ کیسے لوگ ہیں جو آج کل بے کار رہتے ہیں

شاعر کو ہر بات پردے میں رہ کر کرنی پڑتی ہے۔تنقیدی اصطلاح میں اسے علامت نگاری کہا جاتا ہے۔تسکین کے یہاں علات نگاری سے پرہیز کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کی شاعری نہ تو مبہم گوئی کی شکار ہے اور نہ ہی ان کے یہاں پیکر تراشی کا عمل پایا جاتا ہے۔سادہ سیدھا اندازِ بیان ان کا خاصہ ہے۔یہاں ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں موصوف نے حقیقت کو اس کے اصلی روپ میں ہی پیش کیا ہے:۔

بڑا بھائی امیرِ شہر،چھوٹا بھوک سے تڑپے۔مقدر ہر کسی کا ایک سا ہو کیا ضروری ہے
بنی ہیں زینتِ محفل وہی خاتونِ خانہ اب۔انھیں پردے میں رہنا آج کل اچھا نہیں لگتا
ابھی سے اوڑھ لی سنجیدگی معصوم بچوں نے۔ہمارے دور کا بچہ بھی اب بچہ نہیں لگتا
یہ دیکھنا ہے کہ بیٹا سہارا کب ہوگا۔ہم اپنے بوجھ کو تسکیں اٹھائے پھرتے ہیں

موجودہ دور کے سیاست دانوں کی مکاری اور فریب اظہر من الشمس ہے۔لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا الّو سیدھا کرنا ان کے لیے معمولی بات ہے۔پڑھے لکھے لوگ عموماً سیدھے سادے ہی ہوتے ہیں لیکن اکثر سیاسی حضرات جاہل ہونے کے باوجود پڑھے لکھے لوگوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔غریب عوام مختلف پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں۔شاعر کہتا ہے:۔

جہالت کو ملا کرتی ہے گدی اب چناؤ میں۔شرافت کا امیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے
عشرت کدہ میں کٹتی ہے نیتا کی زندگی۔مجبور ہم غریب تو مہنگائیوں میں ہیں

صلاح الدین تسکین نے انسانی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ان کی نظر میں عشق یا عاشقی ایک شوق یا جوانی کے جوش کا نام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔وہ عشق چاہے عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی۔آدمی عشقِ مجازی کی سیڑھی سے عشقِ حقیقی کی منزل تک پہنچتا ہے۔درمیان میں در آئی تمام دنیوی مصیبتیں بس چند دنوں ہی کی مہمان ہوتی ہیں۔تسکین کے عشق کی کہانی ان دنیوی مصائب سے عبارت ہے جو اس کو عہدِ جدید کے طفیل ملے ہیں۔بہر کیف صلاح الدین تسکین کے مجموعۂ کلام "باغِ تصور" میں محاسنِ کلام کے دوش بدوش چند معائب بھی در آئے ہیں مگر شاعری سے ان کے جذباتی لگاؤ کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ وہ ان چھوٹی موٹی غلطیوں پر جلد ہی قابو پا لیں گے۔ان کے مندرجۂ ذیل اشعار ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتے ہیں:۔

اپنی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے غور سے دیکھا تو سمجھا۔آج ہیں زندہ ذکر ہمارا ہوگا کل افسانے میں
رنج و غم درد اور مایوسی۔ڈھونڈ لیتے ہیں سب پتہ میرا
آؤ ہنس کھیل کر بسر کر لیں۔آدمی کی تو زندگی کم ہے
ہاتھ ان کا کبھی جو تھاما تھا۔انگلی انگلی مہک رہی ہے ابھی

مختصراً یہ کہتے ہوئے اپنے اس مضمون کو ختم کر رہا ہوں کہ صلاح الدین تسکین صاحب کا یہ مجموعۂ کلام اردو کے سنجیدہ قارئین کی توجہ اپنی جانب یقیناً مبذول کرے گا۔☆☆☆

شارق عدیل
At/Po,Marhera
Dist,Etah-207401(U.P)

فن اور شخصیت

''باغِ تصور'' کے حوالے سے

محمد صلاح الدین تسکین غزل احساس کی اسیری میں شعری کاروبار کرتے ہیں۔کاروبار میں نے اس لیے لکھا ہے کہ موصوف مشاعرے کے بھی مقبول ترین شاعر ہیں اور کبھی کبھار قطعات کی کاشت میں بھی اپنے کمال وفن کو آزمالیا کرتے ہیں۔لیکن ان کی بیشتر کاوشیں غزل کے حوالے ہی شعری افق پر نمودار ہوتی ہیں اور اپنے خالق کے فکروفن کے تعلق سے گفتگو پر اصرار کرتی ہیں کیونکہ محمد صلاح الدین تسکین کی شاعری میں قدیم وجدید دونوں رنگوں کو ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

میرے خیال میں غزل اپنے تخلیقی لمحوں میں قدیم وجدید کی بحث سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ہے۔کیونکہ غزل کا شعر کلاسیکل احساس سے منور ہو یا جدید رنگ سے' شرط یہی ہے کہ وہ اپنے الفاظ کے اندر خوشگوار تاثر رکھتا ہو' اور اپنی معنوی ترسیل میں بھی گنجلک نہ ہو۔چونکہ غزلیہ شاعری کا مزاج دیگر شعری اصناف کے مقابلے میں خاصا نازک ہوتا ہے اسی بناء پر غزل کھردرے الفاظ اور لہجے کی کڑکتی فضا کو قبول نہیں کرتی ہے۔غزل اشارے کنایے میں گفتگو کرنے کے سلیقے سے مزین شعری صنف ہے۔اس لئے اپنے ماضی کی لفظیات' باغ و بہار' شمع و پروانہ' برق و نشیمن' ساقی و میخانہ' رنج و مسرت' کیف ونشاط' معرفت وتصوف وغیرہ کے استعاراتی نظام کی روشنی میں معنویت کے قافلے کے ساتھ دور تک نکل گئی ہے جس کا تذکرہ آج تک تازہ ہے۔لیکن موجودہ غزل میں لہجے کی بے باک فضائیں بھی قابل ذکر حدوں میں داخل ہوتی جارہی ہیں' کیونکہ اب غزل سماج اور معاشرے کی بدعنوانیوں پر بھی نشتر زنی کرنے لگی ہے۔محمد صلاح الدین تسکین کی غزل بھی اپنے شعری حوالے سے جو نقوش نمایاں کرتی ہے اس میں زندگی کے بیشتر رنگوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

محمد صلاح الدین تسکین کا اولین شعری مجموعہ ''باغِ تصور'' اشاعت کی منزل سے گزر کر منظرِ عام پر آگیا ہے۔اس میں شامل غزلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت سادگی کے ساتھ اپنے مشاہدات و تجربات کو شعری قالب عطا کرکے اپنے قارئین وسامعین کے سپرد کردیتے ہیں اور ان کے ردِ عمل کا انتظار کرتے ہیں۔یہ وصف ہی ان کو قوتِ اظہار عطا کرتا ہے اور زندگی کے ہر واقعے کو کئی پہلوؤں سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور تخیل کی اسی گلی میں شعری انفرادکی ہوائیں چلا کرتی ہیں۔جو شعراء انھیں اپنی شعری مشق کے ابتدائی دنوں میں ہی محسوس کرلیتے ہیں وہ اپنے لہجے کو بھی ابتدا میں ہی دریافت کرلیتے ہیں۔

محمد صلاح الدین تسکین بھی شعراء کے مذکورہ قبیلے سے ہی تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان کے شعری بہاؤ میں روانی کی ہمک کچھ زیادہ ہی ہے۔چند اشعار دیکھیں:

وہ بھی پندار کے بت بناتے ہیں۔میں جو لڑتا رہا غزنوی کی طرح
جس کو دریا سمجھ رہے ہو تم۔وہ چمکتا سراب جیسا ہے
پرندہ زندگی کا لمحہ لمحہ۔سکوں کا آشیانہ مانگتا ہے
اب ہوس کے شہر سے دل بھر گیا۔دکھ کے جنگل میں ٹھہرنے دے مجھے
طوفاں کا پیش خیمہ نہ بن جائے ایک دن۔پُر ہول خامشی جو ہمارے نگر میں ہے
کریں وہ کیسے بھلا رہنمائی اوروں کی۔جو اپنی پشت سے مسند لگایے بیٹھے ہیں
بھول بیٹھے جب سے ہم اسلاف کی تاریخ کو۔اک حقیقت تھے مگر اب داستاں تک آگئے
ابھی سے اوڑھ لی سنجیدگی معصوم چہروں نے۔ہمارے دور کا بچہ بھی اب بچہ نہیں لگتا
پیاس کی گرد کو دھونا ہے لبوں سے اپنے۔میری آنکھوں کو بھی برسات کا موقع دے دے
میرا جنون اور بھی حد سے سوا ہوا۔میرے لئے جو اس نے سلاسل کی بات کی

تحریر کردہ اشعار کے معنوی بطون میں جھانک کر دیکھئے تو زندگی پرت در پرت کھلتی ہوئی نظر آئے گی۔چونکہ پندار کے بت بنانے والوں سے غزنوی کی طرح لڑنا غزل کی وادی میں کچھ نیا نیا سا منظر ضرور محسوس ہوتا ہے مگر چمکتے سرابوں کو دریا تصور کرنے والوں کی نظر فریب کا شکار ہوجاتی ہے۔اس لیے شاعر چمکتے سرابوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے لوگوں کو پوری طرح بیدار رہنے کی تاکید کرتا ہے تاکہ ان کی نظر ہر طرح کے فریب سے محفوظ رہے اور زندگی کا پرندہ سکون کا آشیاں تلاش کرتے ہوئے مایوسیوں کے کنویں میں نہ جا پڑے کیونکہ مردِ مجاہد مایوسی کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔

بقیہ اشعار کی معنوی منزل کی تعمیر میں ہوس کے شہر' دکھ کے جنگل' طوفان کا پیش خیمہ' پُر ہول خامشی' رہنمائی' پشت' مسند' ایسے الفاظ نے مل کر محمد صلاح الدین تسکین کی غزل کا جو منظر نامہ تعمیر کیا ہے اس میں بہت کچھ حال و ماضی اور مستقبل کے حوالے سے بھی سمو دیا ہے۔تسکین چھوٹی بحروں میں بھی بڑی مہارت کے ساتھ شعر تخلیق کرتے ہیں' جب کہ اساتذہ کا خیال ہے کہ چھوٹی بحر میں شعر نکالنا کار دشوار سے بھی زیادہ دشوار ہے۔چھوٹی بحر میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

دھوپ میں ہم دعا کے لفظوں کو۔اپنے سر کی ردا سمجھتے ہیں

(بقیہ صفحہ 27 پر)

سنگ دل ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے تو ہے　　　لوگ کہتے ہیں مجھے اس سے محبت ہے تو ہے

فن اور شخصیت

منیر سیفی
Samanpura.MalikLane
B.V.S, Patna=800014(Bihar)
Mob-9835268274

باغِ تصور اور محمد صلاح الدین تسکینؔ

''باغِ تصور'' محمد صلاح الدین تسکینؔ کا اولین شعری مجموعہ ہے جوان کے ۳۰/سالہ شعری تجربات ومشاہدات کا نچوڑ ہے۔ سعید رحمانی صاحب رقمطراز ہیں:

''خوشی کی بات ہے کہ اب تک کے جمع کیے ہوئے شعری اثاثے کو یکجا کر کے اپنا اولین مجموعہ ''باغِ تصور'' لے کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس کی ابتدا حمد ونعت سے ہوئی ہے۔ پھر ۱۲۲/غزلیں اور آخر میں چند قطعات ہیں۔ سب سے آخر میں ایک نظم مدرسہ سلطانیہ ہے، جس سے وہ منسلک ہیں اور اسے اپنا خراج پیش کیا ہے۔ صلاح الدین تسکین غزل کے شاعر ہیں۔ اس مجموعے میں جو غزلیں ہیں ان کے مطالعہ سے ان کے احساسِ جمال، فکری طہارت، ملی وقومی جذبوں کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی، اخلاقی اور ملک کی بگڑی ہوئی صورت حال کا ایک واضح منظر نامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔'' عبدالمتین جامیؔ کہتے ہیں:

''صلاح الدین تسکینؔ نے انسانی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ آدمی عشق مزاجی کی سیڑھی سے عشق حقیقی کی منزل تک پہنچتا ہے''۔ کتاب کی پشت پر ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی تحریر ہے:

''اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ان کی آواز میں بجلی کی کڑک، چڑیوں کی چہچاہٹ اور معصوم بچوں کی کلکاریاں ''باغِ تصور'' کا سماں پیدا کرتی ہیں''۔

میں صلاح الدین تسکینؔ کے ''باغِ تصور'' سے چند اشعار چُن کر ان کے تعلق سے گفتگو کرنا چاہوں گا۔

غم زیادہ ہے اور خوشی کم ہے۔ اس لیے ہونٹ پر ہنسی کم ہے

یہ شعر شاعر کی اندرونی کیفیات کا ترجمان ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے حصے میں خوشی، غم کی مقدار کی عشر عشیر بھی نہیں آئی ہے۔ لہٰذا شاعر کے ہونٹوں پر ہنسی کا محض شائبہ دیکھا جاسکتا ہے، جسے ہنسی کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں میں یہ بات بھی واضح کردوں کہ 'شاعر کے حصے' سے میری مراد صرف شاعر کا حصہ نہیں بلکہ شاعر جس ملک جس معاشرے میں سانس لے رہا ہے، اس ملک کے اس معاشرے کا غم بھی شاعر کا حصہ ہے۔

جب ہوئے بم کے دھماکے شہر میں تسکینؔ پھر

مجرموں کے درمیاں میرا بھی نام آہی گیا

زندگی اپنی بلا خیز ہوا میں گزری

ایسا لگتا ہے کہ بے نام سزا میں گزری

دونوں اشعار کو دہشت گردی کے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ 'بلا خیز ہوا' سے شاعر کی مراد احیاء پسند فسطائی ذہنیت کا ظلم ستم ہی ہوسکتا ہے۔ جہاں کہیں بم کے دھماکے ہوتے ہیں برقی میڈیا اس کا تار مخصوص تنظیم اور مخصوص فرقے سے جوڑنا شروع کردیتی ہے۔ خفیہ پولیس کو اس کی اطلاع ہو یا نہ ہو برقی میڈیا کو برق رفتاری سے یہ خبر مل جاتی ہے اور پھر میڈیا ٹرائل شروع ہو جاتا ہے۔ بے قصور افراد نا کردہ گناہوں کی پاداش میں گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور ایسے اسیران کو رونگٹے کھڑے کردینے والی تھرڈ ڈگری کی سزا دی جاتی ہے اور جب ان پر عائد کردہ الزامات ثابت نہیں ہوتے اور عدم ثبوت کی بنا پر علمائے دین کی کوششوں اور اللہ کے فضل وکرم سے ان کی رہائی ہوجاتی ہے تب تک پندرہ بیس برس کا cream حصہ گزر چکا ہوتا ہے۔ یہ پندرہ بیس برس جو نا کردہ گناہوں کی سزا بھگتنے میں گزر جاتے ہیں کیا دنیا کی کوئی طاقت انھیں ان کے وہ قیمتی اوقات لوٹا سکتی ہے؟ یہ سوال احیاء پسند فسطائی طاقتوں کے منہ پر زبردست طمانچہ ہے۔

اور کیا وہ مجھے رُلا ئے گا

جتنا رونا تھا رو چکا ہوں میں

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ملک وسماج کے ناگفتہ بہ حالات پر رات دن کڑھتا رہتا ہے، اندر اندر روتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اب وہ 'میدان تنگ آمادۂ جنگ' کے مصداق دو دو ہاتھ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور دشمنوں کو للکارتے ہوئے کہتا ہے

اور کیا وہ مجھے رُلا ئے گا

جتنا رونا تھا رو چکا ہوں میں

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ چوتھے درجے کے ملازمین کے لیے بھی کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ہونا لازمی ہے۔ لیکن کرسیِ وزارت کے لیے اس کی کوئی قید نہیں ہے۔ جو شرافت کے علم بردار ہیں، پڑھے لکھے ہیں، ان کے لیے چناؤ جیتنا مشکل ہی

نہیں ناممکن ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عالم فاضل پر جاہل حکومت کرتا ہے۔اب اس شعر کی قرأت کیجئے ؎

جہالت کو ملا کرتی ہے گدّی اب چناؤ میں
شرافت کا امیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے

یہ شعر بہت ہی صاف شفاف ہے ؎

بہاتا ہے لہو جو دیش میں معصوم لوگوں کا
اسی کو لوگ اپنی قوم کا سردار کرتے ہیں

یہ تو دنیا کے تجربات و مشاہدات میں پندرہ سال قابل آچکا ہے کہ جس نے بے دریغ معصومین کا خون بہایا اسے ہی ہم نے اپنا سردار منتخب کرلیا۔مندرجہ ذیل شعر میں شاعر دوٹوک الفاظ میں متنبہ کرتا ہے ؎

اگر فرقہ پرستی کو نہیں روکا گیا مل کر
کئی ٹکڑوں میں بٹ جائے گا یہ ہندوستاں اپنا

شاعر حب وطن کے جذبہ سے سرشار ہے۔اس نے یہیں کی مٹی سے جنم لیا ہے اور موت کے بعد بھی اسے یہیں کی مٹی کی آغوش میں قیام کرنا ہے۔اس کی خاک ہواؤں کے دوش پر یا گنگا کی چنچل دھار کے ہم راہ کسی بھی ملک کی سرحد عبور نہیں کرنے کی۔لہٰذا وہ اہل وطن کو مخاطب کر کے کہتا ہے' 1947ء میں پاکستان اور 1971ء میں بنگلہ دیش کا وجود میں آنا ہم دیکھ چکے ہیں۔ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ملک کی تقسیم بے شمار بے گناہ انسانوں کے لاشوں پر ہوئی ہے اور تقسیم کے بعد سرحد کی بنیاد بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر رکھی جاتی ہے۔پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں تیسری تقسیم کا کرب جھیلنا پڑے اور کشتوں کے پشتوں لگ جائیں۔لہٰذا ہمیں مل جل کر ملک میں نفرت کی علم بردار احیاء پسند فسطائی طاقتوں کا سر کچلنا ہوگا۔اور موقع آنے پر انھیں ان کی اوقات بتانا ہوگا۔

کرتے ہیں ساز باز وہی دشمنوں کے ساتھ۔جن کو سمجھ رہا تھا کہ وہ بھائیوں میں ہیں

حضرت آدم علیہ السلام کے بڑے بیٹے قابیل اقلیما کے حسد میں اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو مار ڈالا تھا۔یہ دنیا کا پہلا قتل تھا جسے ایک بھائی نے انجام دیا تھا۔مندرجہ بالا شعر کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بھائی سے زیادہ خطرناک کوئی دشمن نہیں ہوتا۔کیونکہ بھائی تمام راز ہائے نہاں سے کما حقہٗ واقف ہوتا ہے۔

ہر اک قدم پہ ہمیں ہو رہی ہے پسپائی۔وہ اپنی فتح کا پرچم اُڑائے جاتے ہیں

ہماری پسپائی کی سب سے بڑی وجہ ناخواندگی' بے حسی' لالچ' ایک مسلمان کی دوسرے مسلمان سے بے وجہ دشمنی اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کو تو ہم مانتے ہیں لیکن اللہ اور اس کے رسول ؐ کی مان کر نہیں دیتے۔ایک مومن دوسرے مومن کو خوش دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ایک مومن دوسرے مومن پڑوسی کو طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا ہے۔یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ایک شخص جنگل میں لوہے کا اوزار لے کر لکڑیاں کاٹنے گیا' لیکن لکڑیاں کاٹنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔دوسرے دن پھر وہی شخص جنگل میں وارد ہوا۔ہرے بھرے درخت نے سوکھے ہوئے درخت سے کہا 'اب کامیاب ہو کر جائے گا' سوکھے درخت نے کہا وہ کیسے؟ ہرے درخت نے کہا 'اس کے لوہے کے اوزار کے ایک سرے پر ہماری برادری (لکڑی) لگی ہوئی ہے۔

یہ تو مقطع میں آگئی ہے سخن گسترانہ بات لیکن ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کرسی کے لالچ میں ہمارے برادران کا احیاء پسند پارٹیوں کے سُر میں سُر ملا کر میڈیا کے روبرو بیان دینے اور قوم کو ناقابل تلافی خسارہ پہنچانے سے بھی نہیں چوکتے اور یہ نظارہ 'عالمی منظر نامہ' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بابری مسجد تنازع کی سماعت ۵/دسمبر ۲۰۱۷ء سے سپریم کورٹ میں ہونے والی ہے۔شیعہ وقف بورڈ نے وشو ہندو پریشد کے سُر میں سُر ملا کر اپنا موقف سپریم کورٹ کے سامنے رکھا کہ "۱۵۲۶ء میں پانی پت کی جنگ میں بابر نے اپنا سکّہ جما لیا تھا۔۱۵۲۸ء میں بابر نے اپنے سپہ سالار میر باقی کو رام جنم بھومی کی جگہ مسجد تعمیر کرانے کا حکم دیا تھا"۔جب کہ حقیقت کچھ اس طرح ہے:۔

Archeology of BabriMsjid Ayodhya کے مصنفین محترمہ سریندر کور اور شیر سنگھ IAS اپنی مندرجہ بالا تصنیف (1992ء....ناشر جیون پبلی کیشنز....نئی دہلی ۔13) میں دلائل کے ساتھ رقم طراز ہیں:۔

"آج جسے بابری مسجد کے نام سے یاد کیا جارہا ہے وہ دراصل بابر سے پہلے مشرقی بادشاہوں کے عہد میں حسین شرقی کی تعمیر کردہ ایک مسجد تھی اور اس کی تعمیر ۸۸۲ھ مطابق ۱۴۷۷ء میں ہوئی تھی۔۱۸۵۷ء کی بغاوت (غدر) کے بعد اسے بابری مسجد کے نام سے موسوم کیا گیا اور ایک طبقہ نے اسے رام جنم بھومی کی جگہ پر بابر کے ذریعہ تعمیر شدہ قرار دینا شروع کردیا"۔

لیکن مذکورہ مصنفین نے اس حقیقت کو پورے دعوے کے ساتھ پیش کیا ہے....."اس مسجد کی تعمیر سے پہلے کسی بھی مندر کا وجود تاریخی دستاویزوں' سیاحوں کے سفر ناموں' زمین کے معافی ناموں یا کتبوں اور تحریروں سے ثابت نہیں ہوا ہے۔"

مسٹر شیر سنگھ IAS نے اپنی ڈی لٹ کی Thesis کے سلسلہ میں برٹش لائبریری میں موجود ممتاز محقق فرانسیسی ہیملٹن بکانن کی اس تحقیقات کو حاصل کے جس میں ایک کتبہ ملا جو اسی حسین شرقی کی تعمیر کردہ مسجد سے برآمد ہوا تھا جس پر یہ عبارت کندہ تھی "میمون علیہ بخطے" جس سے ۸۸۲ھ کا مادہ برآمد ہوتا ہے جسے مسٹر شیر سنگھ نے بابر کی پیدائش سے دو سال پہلے کا سنہ بتایا ہے۔

میں نے ظہیر الدین بابر کی پیدائش کے متعلق تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بابر کی پیدائش ۶/محرم الحرام ۸۸۸ھ مطابق روز جمعہ ۱۴/فروری ۱۴۸۳ء کو ہوئی تھی۔

اس طرح بابر کی پیدائش متعلقہ مسجد کی تعمیر سے شیر سنگھ IAS کے مطابق دو برس بعد اور میرے حساب سے چھ برس بعد ہونا ثابت ہوتا ہے۔مولانا حسامیؔ نے بابر بادشاہ کی ولادت میں یہ تاریخ کہی ہے۔ ؎

چوں در شش محرم زاد آں شہ مکرم
تاریخ مولدش ہم آمد ''شش محرم'' (۸۸۸ھ)

صلاح الدین تسکیںؔ کا ایک اور شعر جو مجھے پسند آیا ؎

چاہا کہ میں سمیٹ لوں ساری بلندیاں۔پرواز کا جنون مرے بال و پر میں ہے

جدید لب و لہجے کا عمدہ شعر ہے اور صلاح الدین تسکیںؔ کے مندرجہ بالا اشعار میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا بھرپور احاطہ کرتا ہے۔اگر تسکیںؔ صاحب اس طرح کے اشعار کہنے کی سعی کریں تو وہ دن دور نہیں جب ان کے اشعار کے مطالعہ اور سماعت سے قارئین کی تسکین ہوگی۔

اپنی بات کے تحت صلاح الدین تسکیںؔ نے فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مجموعہ میں فنی ولسانی تسامحات کے امکانات سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔گزارش ہے کہ کہیں بھی کوئی خامی نظر آئے تو اس کی نشان دہی کر کے مجھے مستفید ہونے کا موقع عطا فرمائیں۔چنانچہ میری نظر میں جو خامیاں آئیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ پہلے الزام جھوٹا لگا کر وہی
چپ کھڑے ہیں یہاں مقتدی کی طرح
۲۔ آج وہ سمجھ رہے ہیں ہمیں غیر کس لئے
۳۔ خاکساری میں تھی پوشیدہ جو لذت تسکیںؔ
آج میں اپنی بلندی سے اتر کر سمجھا
۴۔ جہیز کی زنجیر ہے
۵۔ جس کی امید لیے بیٹھا ہوں
آج تک وہ سحر نہیں آتی
۶۔ وہ آجائے تو گھر میرا اندر کا دربار
۷۔ کیوں میری سوچ پہ پابندیاں لگاتے ہو
الزام سارا دے دیا مقتول کو مگر
۸۔ تسکیںؔ کسی نے بھی تو نہ قاتل کی بات کی
۹۔ تیری ہر بات میں پہلوئے نفی ہوتا ہے
۱۰۔ جہیز کی مانگ ہوتی ہے اگر لڑکے کی جانب سے
۱۱۔ دھرم کے نام پر کب تک سیاست کرتے جاؤ گے

اپنی معلومات میں اضافہ کی غرض سے مندرجہ بالا تسامحات پر خامہ فرسائی کی جرأت کر رہا ہوں۔

۱۔ جھوٹا الزام مجھ پر لگا کر وہی
۲۔ وہ اب سمجھ رہے ہیں ہمیں غیر کی طرح
۳۔ آج میں نے یہ بلندی سے اتر کر سمجھا
۴۔ مصرع ناموزوں ہے
۵۔ یہاں آئی کا محل ہے لیکن ردیف کے مدنظر آج تک کی جگہ 'کیا کہوں' کہا جا سکتا ہے۔
۶۔ صحیح تلفظ 'اندر' ہے یعنی اس میں الف کے سوا تمام حروف ساکن ہیں
۷۔ 'کیوں میری' کی جگہ 'ہماری'
۸۔ الزام سارا رکھ دیا مقتول ہی کے سر۔تسکین کس نے بھی کہا قاتل کی بات کی
۹۔ نفی کا صحیح تلفظ نَف یِ نَفِی ہے
۱۰۔ مصرع ناموزوں ہے
۱۱۔ دھرم بروزن درد ہے

☆☆☆

علیم الدین علیم
P-69-MuialiRoad
P.O:GardenReach
Kolata-700024(W.B)

غزل اصنافِ شاعری میں ایک حسین وجمیل صنفِ سخن ہے۔ یہ صنف ہر دور، ہر طبقہ، ہر تہذیب اور ہر زمانے میں مقبول رہی۔ اب تو متعدد زبانوں میں غزلیں کہی اور سنی جارہی ہیں۔ ماضی میں بھی یہ دل کو لبھارہی تھی اور عصرِ حاضر میں بھی مہذب لوگ اس کے دیوانے ہیں۔ شروع میں یہ صرف حسن و جمال، عشق ومحبت اور گل وبلبل کے اردگرد گھومتی رہی، لیکن آج کی غزل ماضی سے کافی مختلف ہے۔ علامتی اور استعاراتی اظہار نے غزل کی خوبصورتی میں اضافہ کیا ہے، غزل کی سوچ بدل گئی ہے، اس کے مضامین، افکار وخیال میں تبدیلی آرہی ہے، بلکہ مزید اضافے ہورہے ہیں۔ اردو غزل اپنے ظاہر و باطن کے لحاظ سے مختلف اور منفرد مزاج رکھتی ہے۔ سرِدست صلاح الدین تسکینؔ کے شعری مجموعے ''باغِ تصور'' پر میری نظر مرکوز ہے جو ان کا اولین شعری مجموعہ ہے اور یہ 2016ء میں منصۂ شہود پر آیا۔ تسکینؔ صاحب نے تین دہائیوں سے اپنی جبلت کے تقاضے کی تسکین کے لئے نہایت سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ غزل کے گیسو سنوارنے کا عمل جاری رکھا اور اپنے شعری اثاثے کو یکجا کر کے اپنا اولین مجموعہ ''باغِ تصور'' سے اردو ادب کے خزانے میں مزید اضافہ کیا ہے اور اردو کے معروف ناقدین ادب نے ان کی شاعری کے جوہر پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ اس سلسلے میں چند مشاہیر کے اقوال کچھ اس طرح ہیں ''موصوف دراصل غزل کے شاعر ہیں اور غزلیہ شاعری کے میدان میں بہت ہی خوش رنگ پھول بکھیرے ہیں۔ (سید منظور احمد قاسمی) ''صلاح الدین تسکینؔ نے انسانی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی نظر میں عشق یا عاشقی ایک شوق یا جوانی کے ایک جوش کا نام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے''۔ (عبدالمتین جامیؔ) ''ان کے کلام میں سادگی اور بانکپن بھی ہے۔ اگرچہ شاعری کی عمر صرف تیس سال ہے لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے ان کی فکری صلابت اور بالیدہ شعور کا اظہار ہوتا ہے''۔ (حفیظ اللہ نیولپوری)۔ ''ان کی شاعری میں ایک طرف جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف حالات کے سلگتے ہوئے صحرا کی تپش بھی محسوس کی جاسکتی ہے''۔ (سعید رحمانی)۔ ''صلاح الدین کی شاعری جملہ شعری لوازمات کے ساتھ اصلاحی اور افادی پہلوؤں کی حامل ہے۔''۔ (محمد نسیم الدین حبیبی قادری)۔ ''ان کی غزلوں میں ایک لطف ہے، ایک کیفیت ہے اور کچھ ایسی کشش ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو شاعری کی حسین دنیا میں لے جاتی ہے۔'' (پروفیسر قمر الدین خاں)۔ مشاہیر کے یہ اقوال واقعی صلاح الدین تسکینؔ کے لیے اسناد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شعری مجموعہ میں دو حمد، دو نعت پاک، ایک سو بائیس (۱۲۲ر) غزلیں، چند قطعات اور آخری صفحے پر نظم ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے۔ تبھی تو ان کی غزلوں میں جذبۂ احساس، مشاہدات کی ترجمانی، داخلی کیفیات، خارجی زندگی کے مسائل، عصر حاضر کا کرب، سیاسی اور سماجی نابرابری کا درد واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ ان کی شاعری میں روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا حسین امتزاج بھی ہے جس میں تازہ کاری، سنجیدہ بیانی اور معنوی تہہ داری کے ساتھ ساتھ احساسِ محرومی اور حقیقت پسندی کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ تسکینؔ کی شاعری کا کینوس بہت وسیع نہیں تو محدود بھی نہیں ہے۔ انھوں نے بساط بھر اپنے احساسات، جذبات اور تجربوں کو اشعار کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ موصوف نہایت رواں، سادہ اور سلیس زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں جس میں رومانی کے ساتھ ساتھ حزن وملال بھی ہے۔ درج اشعار ملاحظہ کریں: ؎

یہ بھی تو میرے عشق کا ادنیٰ کمال ہے۔ دیکھا ہے اس کا جلوہ جدھر دیکھتا رہا

جب بھی آتی ہے یاد ماضی کی۔ اس سے ملنے کو ٹھہر جاتا ہوں

ہریالی مہکتی تھی ہر سمت تری خاطر۔ تو روٹھ گیا جب سے سوکھا سا ہے گاؤں میں

یہاں جو دھوپ ہے نفرت کی ہر جگہ۔ چلو کہ پیار کی برسات کر کے دیکھتے ہیں

اب ہوس کے شہر سے دل بھر گیا۔ دکھ کے جنگل میں ٹھہرنے دے مجھے

بہاتا ہے لہو جو دیش میں معصوم لوگوں کا۔ اسی کو لوگ اپنی قوم کا سردار کہتے ہیں

رنج وغم درد اور مایوسی۔ ڈھونڈ لیتے ہیں سب پتہ میرا

آؤ ہنس کھیل کر بسر کر لیں۔ آدمی کی تو زندگی کم ہے

جہالت منحرف اظہارِ حق سے۔ مگر ہاتھوں کے کنکر بولتے ہیں

(بقیہ صفحہ 30 پر)

فن اور شخصیت

صابر ادیب
35-Gulkada.Opp:Kachhi Masjid
Shahjahanabad-Bhopal-462001(m.P)
Mob:09303128330

تابدار گہر اور چراغِ ہنر کا شاعر
صلاح الدین تسکین

آج اردو شاعری میں جہاں تخلیقی بنیادوں پر تخلیقات کا رواج جاری ہے وہیں اس میں عصری تقاضوں میں مبنی تفکرات، تجربات و مشاہدات اور انسانی زندگی کے جُڑے معاملات اور رجحانات کا اثر بھی زور وشور سے نمایاں ہے۔ آج کے سائنسی دور نے فن کاروں، تخلیق کاروں کی ذہنی گرہیں کھول دی ہیں۔ وقوع پذیر واقعات و معاملات کو دیکھنے سمجھنے کے حیرت انگیز نظریات مختلف تخلیقات میں دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ آج کا تخلیق کار اپنی داخلی فکر کو خارجی نظریات و سوچ و فکر میں ڈھالنے لگا ہے۔ آج شاعری صرف روزمرّہ کے واقعات و معاملات کا سیدھا سپاٹ اظہار نہیں رہ گئی بلکہ اس میں فکر انگیزی، دل پذیری اور اثر آفرینی ہے۔ شاعر اپنی فکری صلاحیتوں کو جس فن کارانہ اور دانش ورانہ ڈھنگ سے اپنی تخلیقات میں برتتا ہے، تخلیقات میں اتنی ہی گہرائی و گیرائی اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔

انسانی وجود کی شکستگی، تعلقات میں ظاہر داری اور منافقت، جذبوں کی پامالی اور سماجی رشتوں و قدروں میں تصنع و کھوکھلا پن، جن سے آج کا شاعر گزر رہا ہے، اس کی تخلیقات میں ان سب کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے تعفن زدہ اور تناؤ بھرے ماحول میں نظریات، تجربات و مشاہدات کے تفکرانہ عمل اور لہجہ کی انفرادیت برتنے والے شاعروں میں صلاح الدین تسکین بھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

کٹھن حالات میں جینے کا فن ہم کو بھی آتا ہے
اگر لیتی ہے لینے دو یہ گردش امتحاں اپنا
بھروسہ مجھ کو ہے خود اپنے زورِ بازو پر
میں فکر کیوں کروں جب پاسباں نہیں ہے کوئی

اتنا ہی نہیں وہ آگے یہ بھی کہتے ہیں ؎

حق بیانی کے لئے ڈرتا نہیں ہوں میں کبھی
ہاتھ میں لے کر قلم جو کہہ دیا سو کہہ دیا

یہ حوصلہ و ہمت کی بات نہیں.... یقین اور ظرف کی بات ہے، اس تعلق سے ان کا کہنا کیا ہے، دیکھئے ؎

جام کیا ہے زہر بھی پی لوں گا ترے ہاتھوں سے
ساقیا! تو نے مرے ظرف کو سمجھا کیا ہے
جو ہمیں دیتا رہا سوغات پتھر کی سدا
اس کے حق میں روز و شب ہم بھی دعا کرتے رہے

تہذیبِ انسانی کی ابتدا سے بھی شاعروں نے شعری زبان میں گفتگو کی ہے، اور جہد پیہم، یقین محکم سے انسانی زندگی کے ناخوش گوار حالات کے ساتھ ساتھ تاریخ کو بھی بدلا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اسلاف کی محترم اور عظیم روایتوں کے وارث ہوتے ہیں۔ تسکین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں، دیکھیے ؎

بھول بیٹھے جب سے ہم اسلاف کی تاریخ کو
اک حقیقت تھے مگر اب داستاں تک آ گئے
جب سے بھلا چکے ہیں پرانی روایتیں
تسکین تب سے ہم بڑی رسوائیوں میں ہیں

شاعری تخلیق کار کے ذہنی معیار، علم و تفکر اور تجربے و مشاہدے کی آئینہ دار ہوتی ہے جو وقت کی چیرہ دستی سے متاثر نہیں ہوتی اور وہ شاعری متوازن شاعری کے مصداق ہوتی ہے جس میں روایت کا احترام اور فکر و فن میں جدیدیت کا رنگ و آہنگ ہو۔ صلاح الدین تسکین کے یہ شعر دیکھیے ؎

اگر بوتے رہے بارود ہم اپنی زمینوں میں
تو ممکن ہے کہ پیڑوں میں لٹکتا بم کا پھل ہوگا
خلوصِ دل کے سجدوں سے جبینیں ہو گئیں عاری
دعاؤں میں نہیں کوئی اثر لکھوں تو کیا لکھوں
اڑنے لگی ہے دھول عداوت کی ہر طرف
آپس کے پیار زرد ہواؤں میں کھو گئے
میرے مکاں کو آگ لگاتا ہے سوچ لے
شعلہ ہوا کے ساتھ ترے گھر بھی آئے گا
جہالت کو ملا کرتی ہے کرسی اب چناؤ میں

شرافت کاامیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے
پیارومحبت ہمدردی کاڈالے ہوئے چہروں پہ نقاب
لوگ یہاں مصروف ہیں شعلہ نفرت کا بھڑکانے میں
ابھی سے اوڑھ لی سنجیدگی معصوم چہروں نے
ہمارے دور کا بچہ بھی اب بچہ نہیں لگتا
بنی ہے زینتِ محفل وہی خاتونِ خانہ اب
اسے پردے میں رہنا آج کل اچھا نہیں لگتا
جہیز اک مسئلہ بنتا ہے جب کہ لڑکی والوں میں
تو دل میں آرزوں کا سمندر بیٹھ جاتا ہے
بہو کے آتے ہی بیٹے نے پھیر لی آنکھیں
وہی تو میرے بڑھاپے کا اک سہارا تھا

آج انسانی سماج کا دردناک پہلو یہی ہے کہ مُحیر العقول ترقیات اور حیرت انگیز ایجادات کے باوجود انسان کو سکون میسر نہیں۔ جدید دور کی نت نئی ترقیوں نے انسان کو معاشی بدحالیوں اور ذہنی تفکرات کی دلدل میں ایسا ڈال دیا ہے کہ اس سے نکلنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس دور کی مادّہ پرستی نے چین وسکون ہی نہیں صبر و استقلال بھی چھین لیا ہے اور انسان کو زندگی کے تار پود میں ایسا اُلجھا کرر کھ دیا ہے کہ اسے اپنا وجود ہی گراں نظر آنے لگا ہے۔ سماجی رشتوں میں عدم توازن' انسان میں بے ضمیری' اخلاقی قدروں سے گریز و بیزاری' ظاہر ہے ایسے حالات میں شاعر اس کے علاوہ کیا کرسکتا ہے' کیا کہہ سکتا ہے۔

یہاں کی ریت میں عیاریاں پلنےلگیں جب سے
جو بدلے رنگ مجھ کو وہ نگر اچھا نہیں لگتا
ہماری آج کی مطلب پرست دنیا میں
ہر ایک آدمی موقع شناس لگتا ہے
چڑھا ہے رنگ لوگوں پر نئی تہذیب کا جب سے
وہ اپنے گھر کی بدنامی سرِ بازار کرتے ہیں
مرا رفیق مجھے لے چلا ہے جس جانب
وہ راستہ مجھے لگتا ہے قتل گاہ کا ہے
ہر ایک شخص دکھی لگ رہا ہے جب تسکیںؔ
میں اپنے درد کو لوگوں میں عام کیا کرتا
نہ جانے کب کسی کے ہاتھ میں خنجر نکل آئے
ہم اپنے دوستوں کے بیچ بھی ہشیار رہتے ہیں
دشمنی عام ہے زمانے میں
سچ تو یہ ہے کہ دوستی کم ہے

بڑا بھائی امیرِ شہر' چھوٹا بھوک سے تڑپے
مقدر ہر کسی کا ایک سا ہو کیا ضروری ہے
مجھ کو ہے تسکیںؔ کہ میں بانٹتا رہتا ہوں پیار
آپ کے دل میں اگر مجھ سے عداوت ہے تو ہے

انسانی بے ضمیری کے اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہر وقت اس کے سر پر موت اور تباہی و غارت گری کی تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ نفرت و حقارت کے تیر چلتے رہتے ہیں۔ اس کا مداوا صرف محبت' خلوص' ہمدردی اور غم گساری کے سوا کچھ نہیں۔ دیکھئے' تسکیںؔ صاحب اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں' ۔

دلوں کو جوڑ دیتا ہے خلوص اور پیار کا جذبہ
کدورت ہو اگر دل میں تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

پھر بھی وہ اُلجھے اور پریشان حالات سے مایوس نہیں ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شاعری ہی خداوند کریم کا ودیعت کردہ وہ عطیہ ہے جس میں قلب وذہن کو مسحور کرنے اور تقویت دینے اور حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت رکھتی ہے۔ شعور کے دریچوں کو مہکاتی اور خوش گوار ہوا سے لبریز کرتی ہے۔ بھٹکتے ذہنوں کے لئے رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ حتیٰ کہ حزنیہ' المیہ و پریشان لمحوں میں تریاق کا کام کرتی ہے۔ اس لئے وہ بے بانگِ دہل کہتے ہیں' ۔

غم کی گھٹا چھٹے گی بدلے گا حال اِک دن۔ دیکھے گی پھر یہ دنیا میرا کمال ایک دن
اللہ کے کرم سے آئے گی شادمانی
منحوس الجھنوں کا ہوگا زوال اک دن

فطری معصومیت کی جستجو دراصل اپنی ذات کی اعلیٰ ترین تخلیقی جوہر کی تلاش ہے۔ صلاح الدین تسکیںؔ بھی مختلف لہجوں اور شعری رویوں کی بھیڑ میں اپنے لہجہ کی پہچان بنانے میں لگے ہوے ہیں اور وہ اپنے مستقبل سے مایوس بھی نہیں ہیں۔ وہ بڑے وثوق اور یقین کے ساتھ لب کشا ہیں' ۔

ملتی رہے گی روشنی آئندہ نسل کو
جلتا ہوا چراغِ ہنر چھوڑ جاؤں گا
الفاظ کے صدف میں بھی تسکیںؔ ایک روز
معنی کا تابدار گہر چھوڑ جاؤں گا

صلاح الدین تسکیںؔ کا یہی یقیں ان کے خوش آئند مستقبل کا پیامی ہے۔ ان کے لہجے میں تازگی ہے۔ وہ اپنے روزنِ فکر کو اسی طرح کُھلا رکھیں۔ انھیں کی ایک حمد کے مقطع کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ ۔

کر عطا شادابیاں تسکیںؔ کے ہر شعر کو
عمر بھر کرتا رہے وہ تیری قدرت کا بیاں

☆☆☆

وہ چلا دے نہ کہیں تیر ہماری جانب　　اس سے نظروں کو ہٹاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

فن اور شخصیت

ایم۔نصر اللہ نصرؔ
Shalimar Apartment
3.SatayamBoseRoad
DanishShaikhLane
Bakultala.Howrh-711109(W.B)

صلاح الدین تسکینؔ کی شاعری کا اجمالی جائزہ

صلاح الدین تسکین کا شمار کٹک (اڑیسہ) کے ان فکر انگیز اور باشعور شعرا میں ہوتا ہے جن کی شاعری ایک خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہو چکی ہے، جن کے کلام میں سخن کی شہد آمیز لذت پائی جاتی ہے، فکر کی بلندی اور بالیدگی کا اہتمام ہے، عصری آگہی اور معاشرتی سوجھ بوجھ کے نقش پارے ملتے ہیں، جن کا مشاہدہ و مطالعہ قابل لحاظ ہے۔ جن سے اردو کے شعری ادب کو بہت ساری مثبت امیدیں وابستہ ہیں۔

صلاح الدین تسکین بے شک اسم با تخلص انسان ہیں۔ سکون و صبر ان کی ادائے خاص میں شامل ہے۔ اتاولے پن کا ذرا بھی شائبہ ان کے افعال و کردار میں شامل نہیں۔ نہایت ہی شگفتہ مزاج اور دلچسپ انسان ہیں۔ مشفق و مہربان بھی ہیں۔ چند ساعت جو میرے ان کے ساتھ گزرے ہیں ان کی یادیں انمٹ ہیں۔ جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے تو اس سے پہلے کہ میں ان کے بارے میں لب کشائی کروں ان سے متعلق چند آرا ملاحظہ فرمائیں:

''صلاح الدین تسکین کا تعلق اڑیسہ کے مردم خیز شہر کٹک سے ہے۔ وہ نئی نسل کے ایک جواں فکر شاعر ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں سے شعری سفر جاری ہے۔ انھوں نے اس شعری سفر کا آغاز اس وقت کیا جب جدیدیت کا رجحان مقبول ہو چکا تھا۔ ابتدا میں میرؔ کی پیروی اختیار کی۔ پھر ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دور سے گزرتے ہوئے جہاں ان سبھی رجحانات سے اثر قبول کیے وہیں اپنی ایک الگ راہ بھی نکالی۔'' (سعید رحمانی۔ باغ تصور ۔ص۱۲)

''ان کی شاعری میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کہتے ہیں اور اپنے احساسات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں حسن ہے اور حسن کی رعنائی بھی، پھول ہیں اور پھولوں کی مہک بھی، چاند ہے اور اس کی چاندنی بھی۔ سادگی اور سنجیدگی ان کی شاعری کی خاص پہچان ہے۔'' (پروفیسر قمر الدین خاں۔ باغ تصور۔ص۱۶)

مذکورہ آرا کی روشنی میں صلاح الدین تسکین کی شخصیت اور شاعری کی ایک خاص شکل و صورت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ انھوں نے شاعری کے سارے ازم کا اثر قبول کیا مگر کسی کے حصار میں قید نہیں ہوئے۔ سبھی کی پاسداری کی مگر امتیازی رویہ قائم رکھا۔ چونکہ ہر دور میں شعر و ادب کا ایک رجحان رہا ہے اس لیے شعرا و ادبا نے اس کی خصوصی پاسداری کی ہے مگر بنیاد سے ہٹ کر جب کوئی کام کیا جاتا ہے تو اس میں کامیابی برائے نام ہوتی ہے۔ اردو شاعری کی بنیاد رومانیت اور ترقی پسندی رہی ہے اس لئے اس کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ جدت طرازی اس کا شیوہ ہے اس لئے ہر دور میں اس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ صلاح الدین تسکین نے بھی کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ ان کی پوری شاعری میں رومانیت کا عکس نمایاں ہے۔ جس میں حسن کی رعنائی، پھولوں کی مہک، چاندنی کی تابانی اور سادگی، سنجیدگی و شائستگی کی عکس ریزیاں موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کریں:

ان کی یادیں ہیں بکھری ہوئی آج تک۔ دل کی دہلیز پر روشنی کی طرح

ساون کی حسیں رت میں سج دھج کے وہ نکلے ہیں
اب آگ لگا دیں گے ان بھیگی فضاؤں میں

کھنکتی کانچ کی چوڑی جو پہنے گاؤں کی گوری
تو اس کے سامنے سونے کا کنگن ہار جاتا ہے

دل پیش کروں کیسے میں ان کی جناب میں
آتے ہیں سامنے وہ ہمیشہ حجاب میں

یہ چند اشعار ان کی رومانیت پسندی کی مثالیں ہیں حالانکہ ایسے اشعار سے ان کا مجموعہ ''باغِ تصور'' بھرا پڑا ہے، جس کے ایک ایک شعر میں منفرد رنگِ تغزل نمایاں ہے۔ ان اشعار کے مطالعے کے بعد یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ تسکین رومانیت نگاری کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ بلکہ ان کے بیشتر اشعار سے رومان کی کیفیت عکس ریز ہے۔ بطور دلیل عبدالمتین جامیؔ صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

''ان کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں رومانیت کو حاوی رکھنا چاہتے ہیں۔ ناچیز کا خیال ہے کہ صلاح الدین تسکین دراصل رومانی شاعر ہی ہیں لیکن عہد جدید کی تمام ناہمواریاں ان کی اپنی بے لوث رومانی طبیعت کو بغاوت پر اکساتی ہیں'' (باغِ تصور۔ص۸)

دراصل شاعر بنیادی طور پر رومان پسند ہی ہوتا ہے مگر عصری حالات اور تجرباتِ حیات و مشاہداتِ زندگی کا جب وہ شکار ہوتا ہے تو حقائق کے اظہار سے

گریز کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ان کے اثرات سے وہ بچ نہیں پاتا اور دل سے حقیقت حال کا بیان ہو ہی جاتا ہے۔ یہ شاعری کی سچائی ہے۔سخن کی بارگاہ میں اسے قبولیت کا شرف بھی حاصل ہے۔عصری مسائل کی عکاسی شاعر کی تازہ کاری اور بالیدہ ذہنی کو درشاتی ہے۔شاعر کے اندر اس خوبی کا ہونا لازمی ہے۔ وہ شاعر شاعر نہیں جو صرف تصورات کی دنیا میں بھٹکتا ہو اور حقیقتِ حال سے چشم پوشی کرتا ہو۔ بلکہ عصری حالات و مسائل کا تذکرہ اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ تسکینؔ صاحب نے بھی اس رویے کا پاس رکھا ہے اور اپنے ڈھنگ سے حقیقتِ حال بیان کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

امیر شہر کہتے تھے جسے سب ۔وہی اب آب و دانہ مانگتا ہے
میں سمجھتا تھا جسے پھول صفت آج تلک ۔ وہ تو پتھر ہے اسے آج میں چھو کر دیکھا
فاصلہ کھ کے میں ملتا ہوں ہر اک سے تسکیںؔ۔ہاتھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
جہالت کو ملا کرتی ہے گدی اب چناؤ میں۔شرافت کا امیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے
کریں وہ کیسے بھلا رہنمائی اوروں کی۔جو اپنی پشت سے مسند لگائے بیٹھے ہیں

غزل کی ایک اور بڑی خصوصیت اس کے مطلع کا منفرد' خوبصورت اور پر کشش ہونا بھی ہے۔جس غزل کا مطلع دل کش اور پر اثر ہوتا ہے اس کے کمزور اشعار بھی اس کے اثر سے بھاری بھر کم ہو جاتے ہیں۔ مطلع سازی واقعی غزل نگاری کا بڑا کمال ہے ۔ یہ نہ سب کو آتا ہے اور نہ ہر غزل کا مطلع اچھا اور جاذب نظر ہوتا ہے۔اس کے باوجود اردو شاعری میں خوبصورت مطلعے بے شمار کہے گئے ہیں۔تسکین صاحب نے بھی مطلع سازی میں اپنے ہنر کا کمال پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے ملاحظہ کریں:

تیری الفت کی قسم جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ایک پتھر کو صنم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
ہم ان کے ترش لہجے پر بھی خوش گفتار رہتے ہیں
ہمارا ظرف ہے کہ صاحبِ کردار رہتے ہیں
آئینہ بن گیا ہوں تو پتھر بھی آئے گا۔شاید مری شکست کا منظر بھی آئے گا
مسافر چھاؤں میں جس وقت آ کر بیٹھ جاتا ہے
وہاں تھک ہار کر اس کا مقدر بیٹھ جاتا ہے

ایسے ایسے مطلع تسکیںؔ صاحب کی نوک خامہ سے نکلے ہیں جن کی تعریف کرتے زبان تھکنے کا نام نہیں لیتی ۔ دل کی بے چینی بھی نہیں جاتی ۔ان کے مطلعوں کی ورد کا اثر تا دیر ذہن و دل پر قائم رہتا ہے، یہ ان کی شعر گوئی کا کمال ہے۔ویسے انھوں نے اپنی سخن طرازی کو قابلِ افتخار نہیں گردانا ہے۔ یہ ان کی خاکساری ہے۔موجودہ شعرا کی بھیڑ میں صاف ستھری شاعری کرنے والوں میں ان کا قد نکلتا ہوا دکھتا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ ان کی شاعری میں ڈھیر ساری خوبیاں نہیں ہیں۔لیکن جو ہیں وہ قابلِ اعتنا ضرور ہیں۔ عام خیال ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اب شاعری میں کچھ نئی بات کہنے کو نہیں رہ گئی ہے۔سب کچھ کہا جا چکا ہے لیکن نئے لہجے' نیا انداز اور نئے پن کی گنجائش ضرور ہے۔ورنہ شاعری کا باب بہت پہلے ہی بند ہو چکا ہوتا۔شاعری انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ ذہنی سکون کا بہترین وسیلہ ہے۔دل کو بہلانے کا غالب یہ خیال (کام) اچھا ہے۔ اس لئے ابھی شعر کہنے کی گنجائش برقرار ہے اور جب تک انسان زندہ رہے گا اس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔تسکیںؔ صاحب نے ایمانداری کے ساتھ قبول کیا ہے کہ ان کی شاعری میں کچھ نیا پن نہیں ہے ان کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

نیا خیال نئی بات کا سوال نہ کر ۔مری غزل میں نئی داستاں نہیں ہے کوئی

یہ ان کی انکساری بھی ہے اور سچائی بھی مگر کچھ تو ہے جس کی پردہ داری بھی ہے اور عکس ریزی بھی۔ان کی شاعری کے کچھ اور رنگ ملاحظہ کریں:

میرے مکاں کو آگ لگاتا ہے سوچ لے۔شعلہ ہوا کے ساتھ ترے گھر بھی آئے گا
خیمہ لگا کے بیٹھی ہے جب الجھنوں کی فوج۔دل کے نگر میں درد کا لشکر بھی آئے گا
آیا ہے جو بھی لوٹ کے جائے گا ایک دن۔کچھ دیر کی تو بات ہے بس دیکھتے رہو
ہے مقدس میری نظروں میں یہی خاکِ وطن
دست قدرت کا خزانہ اس کے اندر قید ہے

ان اشعار کے مطالعے کے بعد اس اعتراف کا ہونا لازمی ہو جاتا ہے کہ موصوف کی شاعری عمومی ہونے کے باوجود کسی کسی معاملے میں خصوصی بھی ہوئی ہے۔اسلوب اور زبان و بیان میں قدرت وندرت کی کمی کے باوجود انھیں خود پر کافی گرفت ہے۔وہ بہت محتاط ہو کر اپنے اشعار کہنے کے عادی ہیں۔شاعری چونکہ ایک وسیع اور پیچیدہ صنف سخن ہے اور وہ بھی غزل گوئی اس لئے اس کی مکمل پاسداری ہر کسی سے ممکن نہیں۔لیکن ایسا بھی نہیں کہ یہ ایک ناممکن عمل ہے۔اس کے لیے مطالعہ' مشاہدہ' مشق اور ریاضت کی کافی ضرورت پڑتی ہے۔تسکیںؔ صاحب سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ویسے مجموعی اعتبار سے وہ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اچھی شاعری پیش کرنے کی پوری سعی کرتے ہیں۔ان کے چند اشعار اور دیکھ لیں:

رفیق اپنا ہمیشہ باوفا ہو کیا ضروری ہے۔یہاں ہر شخص ہم سے آشنا ہو کیا ضروری ہے
بڑا بھائی امیرِ شہر چھوٹا بھوک سے تڑپے۔مقدر ہر کسی کا ایک سا ہو کیا ضروری ہے
اک بھکارن لٹ رہی تھی بھیڑ میں بازار کی۔لوگ اس کی بے بسی کا جائزہ لیتے رہے
دلوں کو جوڑ دیتا ہے خلوص و پیار کا جذبہ۔کدورت ہو اگر دل میں تو رشتہ ٹوٹ جاتا ہے

کیا یہ اشعار ان کی خوبصورت اور فکر انگیز شاعری کے اعتراف کے لیے کافی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کافی ہیں۔ پروفیسر قمر الدین خان کی اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہی کہوں گا کہ ان کی غزلوں میں ایک لطف ہے' ایک کیفیت ہے اور کچھ ایسی کشش ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو شاعری کی ایک حسین دنیا میں لے جاتی ہے۔

☆☆☆

فن اور شخصیت

اظہر نیّر
Vill&Po,Barhutia.Via.KansiSimri
Dist,Darbhanga-847106(Bihar)

صلاح الدین تسکیںؔ اور باغِ تصور

صوبہ اڈیشا کا شہر کٹک شعر وادب اور علم و تہذیب کا مرکز ہے جہاں بہت سے مشہور و معروف ادباء و شعراء کے درمیان کٹک کے معروف شاعر صلاح الدین تسکیںؔ بھی رہتے ہیں۔ ''باغِ تصور'' کے خالق جناب صلاح الدین تسکیںؔ نے کٹک سے شعری مجموعہ ''باغِ تصور'' مجھے بھیجا ہے جن سے میں قطعاً نا آشنا تھا۔ صلاح الدین تسکین کے مجموعہ کلام کا نظر آجانا ایسا ہی ہے جیسے دھوپ میں چلتے ہوئے مسافر کے لیے کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آجائے۔ وہ غمِ دوراں ہی کو غمِ جاناں سمجھتے ہیں، یہ سچ ہے کہ ان کے یہاں روایت سے بغاوت نہیں کی گئی ہے، اندازِ بیان کی لطافت کسی بھی مضمون کو سطحی ہونے نہیں دیتی۔ ان کا ہر شعر ان کے اپنے جذبات اور خیالات کا ترجمان اور خلوص کا حامل ہے۔ شاعر کے یہاں داخلی اور خارجی دونوں عناصر کی فراوانی ہے۔ انھوں نے ہر بات میں سلیقے کو اس طرح ملحوظ خاطر رکھا ہے کہ ادب میں مواد اور ہیئت دونوں کی اہمیت اور افادیت مسلم نظر آتی ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ ''باغِ تصور'' غزلوں پر مشتمل ہے اور صنفِ غزل کی فنی عظمت کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ صلاح الدین تسکیںؔ کی شخصیت اور شاعری پر جناب سعید رحمانی، عبدالمتین جامیؔ، محمد نسیم الدین جیبی قادری، پروفیسر قمر الدین کے جو معیاری مقالات شامل کتاب ہیں ان سے شاعر کی ادبی شخصیت سے آشنائی کے علاوہ ان کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہیں۔

جناب سعید رحمانی نے صلاح الدین تسکیںؔ بارے میں یوں رقم طراز ہیں ''ان کی شاعری کی بنیاد سلاست زبان و بیان اور جذبے کی صداقت و طہارت پر استوار ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس میں جمالیات کی جاذبیت بھی ہے تو سماجیات کا وسیع تر منظر نامہ بھی پایا جاتا ہے''۔

مشہور ادیب و شاعر جناب عبدالمتین جامیؔ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے ''صلاح الدین تسکیںؔ نے انسانی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ ان کی نظر میں عشق و عاشقی ایک شوق یا جوانی کے جوش کا نام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے وہ عشق چاہے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ آدمی عشق مجازی کی سیڑھی سے عشق حقیقی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ درمیان میں درآئی تمام دنیوی مصیبتیں بس چند دنوں ہی کی مہمان ہوتی ہیں، تسکین کے عشق کی کہانی ان دنیوی مصائب سے عبارت ہے جو اس کو عہد جدید کے طفیل ملے ہیں''۔

پروفیسر قمر الدین خان ''باغِ تصور'' میں یوں رقم طراز ہیں ''ان کی شاعری میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بات دل کی دھڑکنوں کے ساتھ کہتے ہیں اور اپنے احساسات کو خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں حسن ہے اور حسن کی رعنائی بھی، پھول ہیں پھول کی مہک بھی، چاند ہے اور اس کی چاندنی بھی، سادگی اور سنجیدگی ان کی خاص پہچان ہے۔''

صلاح الدین تسکین کی غزلیں نئی سوچ، نئے موسم، نئی لطافت، نیا انداز اور نیا رنگ رکھتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا خاص وصف یہ ہے کہ ان میں ایک تہذیبی اکائی موجود ہے جو اردو غزل کی روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔ اردو ادب میں کبھی کبھی ہی کوئی ایسی آواز سنائی دیتی ہے جو اپنے سوز و ساز اور جذبۂ خلوص کے باعث قلب و گوش تک پہنچ جاتی ہے۔ صلاح الدین تسکین کی آواز امیں یہ وصف نظر آتا ہے۔

اُمید ہے ادبی حلقوں میں ''باغِ تصور'' کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جایے گا۔ کچھ اشعار درج کر رہا ہوں جو مجھے خاص طور سے پسند ہیں۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئیں گے ؎

عیاں ہم اپنے خیالات کر کے دیکھتے ہیں
اگر وہ چُپ ہیں تو ہم بات کر کے دیکھتے ہیں

برسوں سے خیالوں میں ایک چھوٹی کہانی ہے
ہر بات نئی لیکن اک بات پُرانی ہے

طوفاں شناس کرنے ہمیں اس جہان میں۔ تسکیںؔ کوئی ایسا سخنور بھی آئے گا

زندگی کیسی زندگی ہے ابھی۔ ہر کوئی محوِ بے خودی ہے ابھی

تمھارے شہر میں جو ہو رہا ہے۔ لہو میں ڈوبے منظر بولتے ہیں

یہاں جو دھوپ ہے نفرت کی ہر طرف تسکین۔ چلو کہ پیار کی برسات کر کے دیکھتے ہیں

بہاتا ہے لہو جو دیش میں معصوم لوگوں کا۔ اسی کو لوگ اپنی قوم کا سردار کہتے ہیں

جہالت منحرف اظہار حق سے۔ مگر ہاتھوں کے کنکر بولتے ہیں

ہمیشہ بے حسی کی قید میں رہتے ہیں ہم تسکیںؔ۔ مگر دشمن ہماری تاک میں ہشیار بیٹھے ہیں

تسکیںؔ چل پڑا تھا مقدر کی کھوج میں۔ قسمت سے آج تک اسی راہِ سفر میں ہے

☆☆☆

اڑنے لگی ہے دھول عداوت کی ہرطرف　　آپس کے پیار زرد فضاؤں میں کھو گئے

اشفاق برادر
مکان نمبر ۱۳۲/۱۵
بابو پوروہ، کانپور ۲۰۸۰۲۳

''باغِ تصور'' کا شاعر محمد صلاح االدین تسکینؔ

ہر شاعر اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔اس کی بنیاد میں فکر کا وسیع پیکر بلوریں لیتا ہے اور جھوم جھوم کر برسنا اس کا فعل ہے۔

''باغِ تصور'' کے شاعر ہیں محمد صلاح الدین تسکینؔ۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ تسکینؔ کے استادِ محترم سعید رحمانی جو ایک بزرگ کہنہ مشق شاعر و ادیب و مدیر ہیں'انھوں نے اپنے اس شاگرد کے بارے میں یوں فرمایا ہے کہ ''تسکینؔ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف پتہ چلتا ہے کہ روایت کی پاسداری کے ساتھ انھوں نے تازہ ہواؤں کے لئے ذہن کا دریچہ بھی کھلا رکھا ہے۔ان کی شاعری میں ایک طرح کی میانہ روی پائی جاتی ہے اور تہذیبی رویوں سے گزرتے ہوئے اس زوال آمادہ معاشرے کے انسان سے ہم کلام ہیں۔شعر ملاحظہ فرمائیں:

یوں تو جدت ایک اچھی چیز ہے۔ کچھ روایت بھی پُرانی چاہیے
خیمہ لگا کے بیٹھی جب الجھنوں کی فوج۔ دل کے نگر میں درد کا لشکر بھی آئے گا
'پرندہ زندگی کا لمحہ لمحہ۔سکوں کا آشیانہ مانگتا ہے

شاعر ماضی پرست ہے'اس کے یہاں روایت پسندی' رومانیت کے ساتھ ساتھ عصری مسائل ہیں اور وہ اس آئینہ میں ٹوٹے ہوئے عکس دیکھ کر حیران و پریشان ہوتا رہتا ہے'اپنے اضطراب کو یوں زبان دینے کی کوشش کرتا ہے:۔

جب بھی آتی ہے یاد ماضی کی۔اس سے ملنے کو ٹھہر جاتا ہوں
جب سے بھلا چکے ہیں پرانی روایتیں
تسکینؔ تب سے ہم بڑی رسوائیوں میں ہیں
کردار کے چمکتے ستارے بھی آج کل۔تہذیب نو کی کالی گھٹاؤں میں کھو گئے

شاعر موجودہ آج کے نیتاؤں کی بدلتی ہوئی پوشاکیں'بدباطنی'بدعنوانی' ووٹوں کے لالچ میں اصولوں سے انحراف تاکہ کسی صورت گدی مل جائے۔تسکینؔ نے اس ایک شعر میں پوری بات کہہ دی ہے:۔

اسی کے نام کا سکہ ہے رائج اب سیاست میں
گھٹالہ کر کے جو گدی پہ آکر بیٹھ جاتا ہے

''باغِ تصور'' کا شاعر اپنے دور میں دکھ درد'انسانی رشتوں میں آتی دراڑیں'ذاتی مفاد'انسانیت سوزی'بدگمانی اور نفرت سے زہریلے ہوتے ہوئے ماحول کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:۔

دکھوں کی حکمرانی ہے۔ یہ کیسی زندگانی ہے
نہ جانے کب کسی کے ہاتھ میں خنجر نکل آئے
ہم اپنے دوستوں کے بیچ بھی ہوشیار رہتے ہیں

انسانی کردار و عمل میں ہو رہی تبدیلیاں محسوس کر شاعر سوچتا ہے کہ اس کا انجام آخر کیا ہوگا؟اس کی صورت گری اپنے انداز سے اس طرح کرتا ہے۔

وہ سبھی لوگ تو فن بیچنے والے نکلے۔جن رفیقوں کو سدا میں نے سخن ور سمجھا
جو مجھ کو جان کر انجان بن گئے اکثر۔میں ایسے لوگوں سے کوئی کلام کیا کرتا

''باغِ تصور'' کی شاعری زندگی کے کھٹے میٹھے تجربوں کے ذائقے سے روشناس کراتی ہے۔لفظ پر لفظ جوڑ کر خیالات کے گل بوٹے بنانے' سجانے کی بھرپور کوشش میں اپنے وجود میں پلتے ہوئے شعلوں کو یوں اجاگر کیا گیا ہے۔

نیا خیال نئی بات کا سوال نہ کر۔مری غزل میں نئی داستاں نہیں ہے کوئی
جس کو سب لوگ غزل کہتے ہیں۔ ہم اسے تاج محل کہتے ہیں

اپنی صلح پسند طبیعت کی مناسبت سے نفرت کے بنجر کھیت پر پیار کی بارش کرنا چاہتے ہیں مگر پیار کے کھیتوں کو بنجر کرنے والے ایسا نہیں ہونے دیتے۔اس کے باوجود شاعر امن و محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔اس کی تصوراتی آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں' ملاحظہ ہو

یہاں جو دھوپ ہے نفرت کی ہر طرف تسکینؔ
چلو کہ پیار کی برسات کر کے دیکھتے ہیں
مٹا ڈالیں تعصب کو اگر ہم ملک سے اپنے
یہی بھارت محبت کا بھرا پیمانہ ہو جائے

شاعر کبھی کبھی حالات کی سفاکیوں پر دل گرفتہ بھی ہو جاتا ہے اور ٹوٹے دلوں کی فریاد اسے مضطرب کر دیتی ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اپنی شاعری میں امن و محبت کا چراغ روشن کر جایے گا جس سے نسلِ آئندہ کسبِ نور کرتی رہے گی۔

کون سنتا ہے کسی کا حالِ دل اس دور میں۔ بات اپنی مختصر سے مختصر کرتا رہا
ملتی رہے گی روشنی آئندہ نسل کو۔جلتا ہوا چراغ ہنر چھوڑ جاؤں گا

شاعر اپنی اردو زبان سے محبت کرتا ہے'بھرپور کرتا ہے اور دل و جان قربان

کرنے کا جذبہ رکھتا ہے اور کہتا ہے اردو کے چراغ کو مخالفت کی آندھیاں نہیں بجھا سکتیں، اردو میں اتنی نغمگی ہے کہ اس کے مدِّ مقابل جو بھی آتا ہے اس کا اپنا ہو جاتا ہے۔ شعر بھی بڑا عمدہ ہے۔

بجھانے کے لئے آئی تھی آندھی۔ دیا اردو کا لیکن جل رہا ہے

شاعر نے گل و رخسار کی باتیں کی ہیں، محبوب کی اداؤں کا بکھان کیا ہے، چھپی ہوئی خواہشیں بے پردہ ہوئی ہیں، اس کا احساس جواں ہے جو زندگی سے عبارت ہے۔

ہاتھ ان کا کبھی جو تھا ما تھا۔ انگلی انگلی مہک رہے ہیں ابھی
میری ساری غزلیں، نظمیں، گیت اسی کا درپن ہے
ذہن سے جب میں اس کو ہٹا دوں یہ دنیا بے کار لگے

''باغِ تصور'' میں کئی مشاہیرِ ادب کی آراء بھی شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری ''صلاح الدین تسکینؔ کی شاعری بہت چونکا دینے والے عناصر سے مملو نہیں ہے، ان کے کلام میں سادگی ہے اور بانکپن بھی''۔ ''باغِ تصور'' کے پیش لفظ میں عبدالمتین جامیؔ یوں رقم طراز ہیں ''ناچیز کا خیال ہے کہ صلاح الدین تسکینؔ در اصل رومانی شاعر ہیں لیکن عہد جدید کی تمام ناہمواریاں ان کی اپنی بے لوث رومانی طبیعت کو بغاوت پر اکساتی رہتی ہیں۔'' اور پروفیسر قمرالدین خاں یوں کہتے ہیں ''تسکینؔ کی غزلوں میں ایک لطف ہے، ایک کیفیت ہے، اور کچھ ایسی کشش ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو شاعری کی حسین دنیا میں لے جاتی ہے''۔ چند شعر دیکھئے کہ:

تمام دن تو بڑی بے کلی میں بیت گیا۔ پھر ان کی زلف کے سائے میں شام کیا کرتا
ابھی سے اوڑھ لی سنجیدگی معصوم بچوں نے۔ ہمارے دور کا بچہ بھی اب بچہ نہیں لگتا
مری تسکینؔ کی حسیں تتلی۔ اب مجھے کیوں نظر نہیں آتی

صلاح الدین تسکینؔ نے ''باغِ تصور'' میں وہ رنگ بھرے جو زندگی کی صبح و شام اور بے چینی و بے قرار روح کے منظر میں ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں جس باغ کا خوبصورت تصور ہے اس میں پت جھڑ کی سسکیاں بھی ہیں تو بہاروں کی شادمانی بھی مگر جو بھی ہے زندگی ہے اور بہت حسین و جمیل ہے۔ راستہ آسان نہیں پُر خطر بھی ہے مگر یہ مان کر بیٹھ جانا کہ میں طالب علم نہیں ہوں، پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ ''باغِ تصور'' کی غزلیں اور قطعات دیکھنے اور پڑھنے پر اکساتے ہیں۔ مجموعی طور پر باغِ تصور قاری کو ایک ایسے خوبصور چمن کی سیر کراتا ہے جس میں رنگ برنگی پھولوں کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے انھیں کے شعر پر میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

اس باغِ تصور میں آ کے تو ذرا دیکھو
ہر پھول میں خوشبوئے تسکینؔ مہکتی ہے

☆☆☆

(''باغِ تصور'' کے حوالے سے کا بقیہ)

زندگی کی راہ میں۔ امن کا سفیر ہوں
یہ تو میرے خواب کی۔ دکھ بھری تعبیر ہے۔ فیض کا دریا بنو۔ یہ تمھاری شان ہے

تسکینؔ کی چھوٹی بحور کی غزلیات میں زبان و بیان کے لطف سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ان کی معنوی گہرائی بھی لائقِ تعریف ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر موضوعات کو انھوں نے جزوِ شاعری بنایا ہے جن میں وطن کی محبت، قرآن حکیم کی روشنی، محبوب کے ناز و انداز، غموں کے بوجھ سے بکھرتے ہوئے انسانوں کی کیفیت اور بدکردار خون ریز سیاست اپنے مکمل وجود کی نمائندگی کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

میں اس پہ جان کی بازی لگا بھی سکتا ہوں۔ مگر سوال محبت کی اک نگاہ کا ہے
خاکِ وطن کے ذرّوں سے رشتہ ہے خون کا۔ ہجرت کریں گے کس طرح ہندوستاں سے ہم
اس کو تو تم نے طاق کی زینت بنا دیا۔ کیسے ملے گا فائدہ اُم الکتاب سے
غموں کا ذائقہ بھی لطف دیتا ہے ہمیں لیکن۔ بھلا کیوں زندگی سے آپ یوں بیزار رہتے ہیں
سبھی ڈالے ہوئے ڈوری ہیں دریائے سیاست میں اگر اس پار کچھ ہیں تو کئی اس پار بیٹھے ہیں

مذکورہ اشعار ایک آئینے کی مانند ہیں جس میں عصری آگہی پوری طرح عکس ریز ہے۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ''باغِ تصور'' کا پیش لفظ اڈیشا کے معتبر شاعر و ادیب عبدالمتین جامیؔ نے تحریر کیا ہے اور تسکینؔ کے شعری مستقبل کے لیے دعائیں بھی کی ہیں۔ لیکن مجموعے کی پشت پر جو ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی رائے کو شامل کیا ہے مجھے ان کے ان الفاظ سے اتفاق نہیں ہے۔ اگرچہ شاعری کی عمر تیس سال ہے لیکن اسے کم نہیں کہا جا سکتا۔ اس مدت کے اندر کوئی بھی شاعر شعری بالیدگی حاصل کر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری کے ابتدائی بیس برس ہی شاعر کے وقار و اسلوب کو نمایاں کرتے ہیں اور دنیا میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں John Keats کی زندگی کا چراغ تو ۳۰ ربرس کی عمر سے قبل ہی گل ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی رومانی شاعری کی پوری دنیا مدّاح ہے۔ اس لیے عمدہ شاعری کے تعلق سے کم و بیش عمر کوئی معنیٰ نہیں رکھتی۔ اور یہ کہاوت کہ شاعر بڑھاپے کی عمر میں جوان ہوتا ہے، سو اس کی بنیاد میں قیاس کی آمیزش کچھ زیادہ ہی لگتی ہے۔

خدا کا شکر ہے صلاح الدین تسکینؔ خالقِ کائنات کے کرم سے ۳۰ ربرس سے شعری سفر پر رواں دواں ہیں۔ موصوف کی شاعری میں کہیں کہیں معمولی قسم کی اغلاط بھی نظر سے گزرتی ہیں، مگر مجموعی صورت میں ان کی شاعری متاثر کرتی ہے، کیونکہ ان کی شعری تربیت اردو زبان کے کہنہ مشق شاعر و ادیب، سہ ماہی ''ادبی محاذ'' کے مدیرِ اعلیٰ سعید رحمانی صاحب کی ادبی پاٹھ شالہ میں ہوئی ہے۔ اس لیے صلاح الدین تسکینؔ سے توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے ''باغِ تصور'' کی شاعری کی شعری حلقوں میں پذیرائی کی جائے گی۔ میں مضمون کے آخر میں ان کا ایک ایسا شعر درج کر رہا ہوں جو اپنے معنی و مفہوم میں امید افزا احساسات کو روشن کرتا ہے۔

شعر و سخن میں ہوگی اگر وسعتِ خیال۔ کوزے میں خود سمٹ کے سمندر بھی آئے گا

☆☆☆

ارشد قمر
ڈالٹن گنج (پلامو)
جھارکھنڈ

فن اور شخصیت

محمد صلاح الدین تسکینؔ "باغِ تصور" کے آئینے میں

کٹک اڑیسہ کا ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جہاں کی مقتدر اور گراں قدر شخصیتوں نے ابتدا سے آج تک اردو ادب کی زلفِ گرہ گیر کو سنوارنے میں اپنی عمرِ عزیز صرف کی ہے۔ ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست ہمیں ملتی ہے جنھوں نے اپنے خونِ جگر جن کا خونِ جگر گلشنِ اردو کی آبیاری کی ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اسی فہرست میں ایک اہم نام صلاح الدین تسکینؔ صاحب کا بھی ہے جو نئی نسل کے جواں فکر اور تازہ کار شاعر ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "باغِ تصور" ۲۰۱۵ء میں منصۂ شہود پر آچکا ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔

تسکینؔ صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا ایسے دور میں کی جب جدیدیت کا رجحان عام تھا۔ اس کے بعد ماجدیدیت کا بھی دور آیا۔ تسکینؔ صاحب نے ان ادوار کا اثر تو قبول کیا مگر اپنی شاعری پر ان کے اثرات کو مرتب نہیں ہونے دیا۔ بلکہ انھوں نے اس سے الگ سمت اور راہ متعین کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے روایت سے اپنا رشتہ قائم رکھا ہے۔ اور اسی کی پاسداری میں اپنی شاعری کو پروان چڑھا رہے ہیں۔ ؎

میری آنکھوں میں وہ ٹہلتا ہے ۔ اس کی آنکھوں میں کھو چکا ہوں میں
یہ بھی تو مرے عشق کا ادنیٰ کمال ہے ۔ دیکھا ہے اس کا جلوہ جدھر دیکھتا رہا

مجموعے میں شامل ان کی زیادہ تر غزلیں عصری حسّیت کی حامل ہیں۔ جس کا اظہار انھوں نے کہیں راست تو کہیں استعاراتی پیرایے میں کیا ہے۔ ان غزلوں سے شاعر کی عصری آگہی، صالح قدروں کی پاسداری، حق گوئی اور بے باکی کا اظہار ہوتا ہے۔ کہیں کہیں انہدام پذیر معاشرے پر بھی نشتر زنی کی ہے۔ ؎

یہاں جو دھوپ ہے نفرت کی ہر طرف تسکینؔ ۔ چلو کہ پیار کی برسات کر کے دیکھتے ہیں
جھوٹوں کے ساتھ رکھتا نہیں اپنا رابطہ ۔ سچائی دیکھنے کی نظر ہے تو بات کر
میں جس کے ساتھ چلا جاؤں اپنی منزل تک ۔ مرے نصیب میں وہ قافلہ نہیں آیا

تسکینؔ صاحب کے ایسے متعدد اشعار مل جائیں گے جن سے ان کی فکری صلابت اور بالیدہ شعور کا ثبوت دیا ہے۔ بقول سعید رحمانی "ان کی شاعری میں اگر ایک طرف جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف حالات کے سلگتے ہوئے صحرا کی تپش بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔"

بلاشبہ رحمانی صاحب کی گراں قدر آراء ان کی شاعری پر صادق آتی ہے۔ ان کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ جو محسوس کرتے ہیں اُسے لفظوں کا جامہ پہنا کر شعری تجسیم کر دیتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ایک حسن ہے، ایک ایسی حدّت ہے جو آہستہ آہستہ قاری کے دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ ؎

تمام دن تو بڑی بے کلی میں بیت گیا ۔ پھر ان کی زلف کے سایے میں شام کیا کرتا
یہ بھی تو اعجاز ہے اپنے جنونِ عشق کا ۔ ہم زمیں پہ چلتے چلتے آسماں تک آ گئے
غموں کا ذائقہ بھی لطف دیتا ہے ہمیں لیکن ۔ بھلا کیوں زندگی سے آپ یوں بیزار ہوتے ہیں

ان کی شاعری میں رومانیت کا عنصر بھی غالب ہے۔ ہر شاعر کی اپنی ایک انفرادیت ہوتی ہے جس کا اثر اس کی بیشتر غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بلا کی روانی، جوش و ولولہ اور توانائی کے ساتھ ساتھ ندرتِ خیال اور سادگی، متانت اور سنجیدگی بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کا بڑے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ چونکہ شاعر کا دل بڑا ہی حسّاس ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے قرب و جوار میں رونما ہونے والے واقعات سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں روزمرہ پیش آنے والے واقعات و سانحات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کبھی ان شعروں میں بجلی کی کڑک ہوتی ہے تو کبھی بچوں کی معصومیت شامل ہوتی ہے۔ تبھی تو جناب ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں۔

"اسلوبیاتی نقطۂ نظر سے ان کی آواز میں بجلی کی کڑک، چڑیوں کی چہچہاہٹ اور معصوم بچوں کی کلکاریاں باغِ تصور کے ماحول کا سماں پیدا کرتی ہے"۔ یہ شعر دیکھیں:

میں نے رکھا ہے صداقت کو صدا پیشِ نظر ۔ ہو بھی جائے سر قلم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
ان کی یادیں ہیں بکھری ہوئی آج تک ۔ دل کی دہلیز پر روشنی کی طرح
حق بات کہنے والا مجھے ہے عزیز تر ۔ تو بھی جو ایک ایسا بشر ہے تو بات کر

مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ لفظوں کے انتخاب میں بہت محتاط نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور طرفگی کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری ابہام کا شکار نہیں۔ وہ بڑے ہی سادہ سلیس زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

میں ان کے ایک خوبصورت شعر پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔ ؎

اس باغِ تصور میں آ کر تو ذرا دیکھو ۔ ہر پھول میں خوشبوئے تسکینؔ مہکتی ہے☆

فن اور شخصیت

ڈاکٹر سید غلام ربانی ایاز
E.A.C Colony, Behind District Court.
Raipur-492001(C.G)

صلاح الدین تسکین کے ''باغِ تصور'' کا جمالیاتی رنگ

وحید العصر شاعر محمد صلاح الدین تسکین کے شعری مجموعہ ''باغِ تصور'' میں جمالیاتی شاعری کی امتیازی خصوصیت کی جھلک انھیں خلوت پسند، متین اور باغ و بہار شخصیت کے بطور روشناس کراتی ہے۔ یوں تو ان کی شاعری میں عہدِ حاضر کے سلگتے مسائل کی تمازت کا احساس بھی ہوتا ہے مگر اس میں جمالیاتی رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ اس میں جو فضا استوار ہوئی ہے وہ شہر کے شور شرابے سے دور دیہقانی ماحول کے ایسے دل کش مناظر پیش کرتی ہے جس سے قاری سحر زدہ ہو جاتا ہے۔ تسکین نے جس معاشرتی فضا میں پرورش پائی ہے اس میں جدیدیت کا رنگ گہرا ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی الگ راہ نکالی ہے جس میں زبان و بیان کی شگفتگی اور دل کش خیال آرائی لائقِ تحسین ہے۔ مختصر یہ کہ موصوف کی شاعری کا رسیلا پن لاجواب ہے۔ نیز تخلیقی تصور کی حسن کاری اُن کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے۔ آپ رومانی تصور کے فن کار، بالیدہ فکر و نظر کے مالک اور جمالیاتی روایت کے علم بردار ہیں۔ مثالاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جس کو سب لوگ غزل کہتے ہیں۔ ہم اُسے تاج محل کہتے ہیں

اس میں اگر عہد ماضی کی یاد ہے تو اس شعر میں موجودہ حالات کی تلخ حقیقت رونما ہے، دیکھیں:۔

سنگ دل ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے تو ہے
لوگ کہتے ہیں مجھے اس سے محبت ہے تو ہے

چونکہ سعید رحمانی موصوف کے اُستاد ہونے کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ کے شاعر ہیں ممکن تھا کہ تسکین بھی استاد کے رنگ میں ڈھل جاتے لیکن انھوں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مختلف راہ بنائی جسے ہم جمالیاتی رنگ سے موسوم کر سکتے ہیں۔ تاہم ان کی عصری حسیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اپنی شاعری میں کہیں کہیں معاشرے کی ناہمواریوں کی نشاندہی بھی انھوں نے بڑی بے باکی سے کی ہے۔ روایت میں نیا پن ہے اور ساتھ ہی سوز و گداز بھی ہے اور صاحبِ فہم و بصیرت کی نازک خیالی بھی ہے۔ ساحرانہ لب و لہجہ میں سادگی ہے تو باوقار زبان و بیان میں اصول پرستی بھی ہے۔ موصوف کی شاعری میں جہاں جوش و ولولہ ہے وہیں ذاتی تجربات و مشاہدات کو اس طرح شعری زبان عطا کی ہے ان کی پہلو دار شخصیت کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ علامتی و ایمائی اندازِ بیان کے ساتھ تغزل اور نغمگی بھی ہے۔ خیال آفریں حسن و جمال کا انوکھا پن دلآویز ہے۔ رومانی لب و لہجے کی پختگی اور لچک کی رنگارنگی دل لبھاتی ہے۔ اس میں لوک کہانی کا پُٹ بھی ہے۔ قدرت کے آغوش میں پروان چڑھتی محبت کی ماورائیت جلوہ کناں ہے۔ شاعر مسلکِ حسن پرستی کو ترقی دیتا نظر آتا ہے۔ شاعر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے حسن و جمال کی ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں جدید دور کے روح فرسا حالات سے نجات کا احساس ہونے لگتا ہے۔

بہر حال اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ موصوف کی شاعری افسردگی دور کر کے دل کو شاداں و فرحاں کرتی ہے۔ یہ حیات بخش تازہ کاری شاعر کے فکری ارتقا، بلند پروازی، قوتِ متخیلہ کی رہینِ منت ہے۔ ''باغِ تصور'' کی شاعری ہمیں ایک ایسے شاعر سے متعارف کراتی ہے جو اپنی سوچ کو لفظوں کا پیرہن عطا کرنے کے ہنر سے بخوبی واقف ہے۔

مجموعی طور پر یہ تاثر ابھرتا ہے کہ موصوف میں جمالیاتی حس بدرجۂ اتم موجود ہے اور یہی ان کی شاعری کا امتیازی رنگ ہے۔ ملک کی آب و ہوا سے موافقت پیدا کرنے والی جمالیاتی شاعری عجیب و غریب ہوتے ہوئے بھی کس قدر جانی پہچانی سی ہے۔ بقول ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری ''اُن کی شاعری کے مطالعہ سے اُن کی فکری صلاحیت اور بالیدہ شعور کا اظہار ہوتا ہے''۔ اسی سیاق و سباق میں محمد صلاح الدین تسکین کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

کر عطا شادابیاں تسکین کے ہر شعر کو۔ عمر بھر کرتا رہے وہ تیری قدرت کا بیاں
وہ ہیں محبوب، رب، ساقی، کوثر، شافع محشر
وہ ناداں ہیں جنھیں آیا نہیں ہے اعتبار اب تک

تشبیہات:۔

عمر اپنی ہے چلتی گھڑی کی طرح۔ زندگانی ہے بہتی ندی کی طرح
اپنی پہچان کھو چکا ہوں میں۔ اک معمہ سا ہو چکا ہوں میں

استعارات:۔

سکونِ دل میسّر ہے ہمیں سادہ مزاجی سے۔ جو پیچ و تاب کھاتے ہیں وہی بیمار رہتے ہیں
تھا اپنا آشیانہ بھی بامِ عروج پر۔ ہم مثلِ کہکشاں تھے ابھی کل کی بات ہے

تلمیحات:۔

وہ بھی پندار کے بت بناتے ہیں۔ میں بھی لڑتا رہا غزنوی کی طرح

اُس کوتو تم نے طاق کی زینت بنادیا۔ کیسے ملے گا فائدہ اُم الکتاب سے
ہے فقیری میں شانِ سلطانی۔ آپ جیسی کوئی مثال نہیں
کیوں ٹینک سے توپوں سے ڈراتے ہو ہمیشہ
کیا تم نے ابابیلوں کا لشکر نہیں دیکھا

محاورات:۔

دل چرانے کی ادا ان کی بہت ہے دل نشیں
چور کی داڑھی میں تنکا' یہ کہاوت ہے تو ہے
نظر پڑتی ہے جب حالات پہ من ہار جاتا ہے
کہ جیسے دھند کے حملوں سے درپن ہار جاتا ہے
نہ اتراؤ جوانی پر۔ یہ شے تو آنی جانی ہے

خیال بندی:۔

سنگ دل ہے' بے وفا ہے' بے مروت ہے تو ہے
لوگ کہتے ہیں مجھے اس سے محبت ہے تو ہے
سندر مکھڑا' چنچل نینا' زلف گھنیرے بادل سے
میں جب اس کی جانب دیکھوں اک انجانا پیار لگے

پیغام:۔

رہے بیگیں گے لوگ گھنی چھاؤں میں جہاں۔ الفت کا سایہ دار شجر چھوڑ جاؤں گا
ہمیشہ پیار کا پیغام دے کے ہم تسکینؔ۔ دلوں کو جوڑتے رہتے ہیں یہ برا تو نہیں
کام جو آ نہ سکے لوگوں کے دنیا میں ایسے جینے میں اے تسکینؔ بھلا رکھا کیا ہے

سماجی برائی:۔

جہیز اک مسئلہ بنتا ہے جب کہ لڑکی والوں میں
تو دل میں آرزوؤں کا سمندر بیٹھ جاتا ہے

ماں کی ممتا:۔

جو ماں کا سایہ تھا سر پہ وہ ہٹ گیا جب سے
ستم کی دھوپ میں اب سائباں نہیں ہے کوئی

یادِ ماضی:۔

پلٹ کر دیکھ لو تم اپنا ماضی ۔ گئے وقتوں کے پتھر بولتے ہیں

عبدالمتین جامیؔ کے مطابق ''صلاح الدین تسکینؔ نے انسانی زندگی کا قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ان کی نظر میں عشق یا عاشقی ایک شوق یا جوانی کے جوش کا نام ہی نہیں بلکہ انسانی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ عشق کے بغیر زندگی ادھوری ہے، وہ عشق چاہے عشق مجازی ہو یا عشق حقیقی۔ آدمی عشق مجازی کی سیڑھی سے عشق حقیقی کی منزل تک پہنچتا ہے''۔

بقول سعید رحمانی ''صلاح الدین ایک جواں فکر شاعر ہیں۔ چنانچہ اُن کی شاعری میں اگر ایک طرف جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف حالات کے سلگتے ہوئے صحرا کی تپش بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔''

پروفیسر قمرالدین خاں کے مطابق ''ان کی غزل میں حسن ہے اور حسن کی رعنائی بھی' پھول ہیں اور پھول کی مہک بھی' چاند ہے اور اس کی چاندنی بھی' سادگی اور سنجیدگی بھی جو اُن کی شاعری کی خاص پہچان ہے۔''

محمد نسیم الدین حبیبی قادری کی نظر میں ''بہر حال صلاح الدین کی شاعری جملہ شعری لوازمات کے ساتھ اصلاحی اور افادی پہلوؤں کی حامل ہے جس کے لئے وہ بہر طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔''

چونکہ محمد صلاح الدین تسکینؔ کی شاعری میں تفصیل سے گفتگو کرنے کی یہاں کوئی گنجائش نہیں پھر بھی اتنا تو کہنا ہی ہوگا کہ موصوف کی شاعری کا مستقبل تابناک و درخشاں ہے۔ اگر اُن کا یہی رنگ و آہنگ قائم رہا تو اُن کی شاعری اس عہد زرّیں کی یاد دلائے گی جس میں عمر خیام' حافظ شیرازی اور مولانا جلال الدین کا نام بے ساختہ زبان پر آجاتا تھا۔ اگر یہ ممکن نہیں ہوتا تو وہ اس طرح نہیں کہتے:

کرتے ہیں یوں تو شاعری سب لوگ آج کل۔ گر تیری شاعری میں اثر ہے تو بات کر
تسکیں نے غزل کو بھی۔ آ ئینہ بنا یا ہے
خدا کی حمد میں لکھتا ہوں تسکینؔ ۔ میرے شعروں میں تابانی رہے گی
شاعری کو بنالے آئینہ۔ ترا چرچا بھی چار سو ہوگا
تری غزل میں تو تسکینؔ ایسی بات نہیں۔ مگر یہ بزم میں کیوں شور واہ واہ کا ہے

''باغِ تصور'' ان کے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ ہے جس کی فضاؤں میں رنگ برنگی پھولوں کی مہک قاری کے مشامِ جاں کو معطر کر رہی ہے۔ امید ہے کہ ان کا اگلا پڑاؤ تصورات کی ایک نئی دنیا کی سیر کرائے گا۔

☆☆☆

(صلاح الدین تسکینؔ کی غزل گوئی کا بقیہ)

ظلمتوں کی بھیڑ میں۔ روشنی کا میر ہوں
ہمیشہ بے حسی کی قید میں رہتے ہیں ہم تسکیں۔ مگر دشمن ہماری تاک میں ہشیار بیٹھے ہیں
آگے کی سمت بڑھ گیا لوگوں کا کارواں۔ پیچھے سے میں ہی گردِ سفر دیکھتا رہا
برسوں سے خیالوں میں اک چھوٹی کہانی ہے۔ ہر بات نئی لیکن اک بات پرانی ہے
یوں تو جدّت ایک اچھی چیز ہے۔ کچھ روایت بھی پرانی چاہئے

تسکینؔ کی غزلیہ شاعری میں موضوعات کا تنوع' اسلوب کی رعنائی' طرزِ بیان عمدہ اور لہجے میں جذبات کی دھیمی دھیمی لَو قاری کے دل میں جہاں حدت پیدا کرتی ہے وہیں ان کے ستھرے ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ اردو حلقوں میں ''باغِ تصور'' کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

☆☆☆

محمد نسیم الدین حبیبی قادری
ہیڈ ماسٹر گو.جی درڑاہائی اسکول
بھدرک (اڈیشا)

فن اور شخصیت

تسکینؔ کی شاعری میری نظر میں

خدا کا شکر ہے کہ جناب صلاح الدین تسکیؔ اس دور کے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عہد کی سچی تصویر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں تو ہر شاعر حساس ہوتا ہے مگر تسکینؔ میں حساسیت کا عنصر کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تاثر پذیری کی حامل ہے۔ بحر چھوٹی ہو بڑی اظہارِ خیال میں مانع نہیں ہوتی۔ اس لئے ترسیل وابلاغ کا بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ بڑی ہنرمندی سے وہ اپنے خیالات کو شعری پیکر میں ڈھالتے جاتے ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے واذاارد نـــاان نهـلـك قـرية أمـرنـا متـرفيهـافـفسقوا فيهافحق عليهاالقول فـدمـرنـــاهـــاتـد ميـراً یعنی اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب ہم کسی گاؤں (علاقہ) کو تباہ کرنا چاہتے ہیں وہاں کے خوش حالوں کو حکم فرماتے ہیں تو وہ ہماری نافرمانی کرتے ہیں تو ان پر حجت تمام ہوجاتی ہے' پھر اسے بری طرح برباد کردیتے ہیں۔ تسکینؔ صاحب فرماتے ہیں:۔

حالات پل میں بنتے بگڑتے ہیں کس طرح؟
اس میں کسی کا ہاتھ ہے بس دیکھتے رہو

بننا اور بگڑنا تو نہیں بلکہ بنانا اور بگاڑنا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ بھی پل بھر میں۔ ارادۂ ہلاکت پہلے ہے۔ تباہی اور بربادی بعد میں۔ کسی نادیدہ ہاتھ کی کاریگری کو ملاحظہ کرنا ''بس دیکھتے رہو'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تسکینؔ پر تبصرہ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ ان کی اکثر غزلوں کا مطالعہ کیا۔ کہیں کوئی شعر حدودِ شرع سے متجاوز نظر نہیں آیا۔ کہیں تو صاحبِ کردار اور صاحبِ ایمان نظر آتے ہیں اور کہیں معاشرتی ناہمواریوں پر نشتر زنی کرتے ہوئے۔ عصری حالات کا مشاہدہ بڑی گہرائی سے کیا ہے اور اردگرد رونما ہونے والے سانحات وحادثات کو خوبصورت شعری زبان عطا کی ہے۔ شعری زبان میں اس طرح بمباری کرتے ہیں:۔

اگر بوتے رہے بارود ہم اپنی زمینوں میں
تو ممکن ہے کہ پیڑوں پر لٹکتا ''بم'' کا پھل ہوگا

بم کا پھل یعنی نفرت پھیلانے کا انجام کیا ہوگا' سبھی جانتے ہیں۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی کی طرز پر چلتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

عریانیت سے حسن کا موشن بدل گیا۔ دنیا میں عاشقی کا ایموشن بدل گیا
پہلے کی طرح اب وہ وفاداریاں کہاں۔ اس دور میں تو عشق کا فنکشن بدل گیا

اسی رنگ میں ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں:۔

ساری دنیا میں مرا دیش پپولر ہے بہت
کیونکہ سب ملکوں میں یہ ملک سیکولر ہے بہت

غرض کہ کن کن خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے۔ ان میں حالات کی ستم ظریفی بھی ہے' معاشرتی کجروی بھی' صالح روایات کی بازیافت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے اور انسانی سماج میں در آئی برائیوں پر نشتر زنی بھی کی گئی ہے۔ مختصراً میں نے ان پہلوؤں کا صرف حوالہ ہی دیا ہے۔ تفصیلات میں جانے کے لئے وقت اجازت نہیں دیتا۔ بہرِ حال صلاح الدین کی شاعری جملہ شعری لوازمات کے ساتھ اصلاحی اور افادی پہلوؤں کی حامل ہے جس کے لئے وہ بہر طور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ☆☆☆

درد کو اپنے بھلا کر اکثر   دل کی تسکین کا حل کہتے ہیں

فن اور شخصیت

سعید رحمانی
مدیرِ اعلیٰ ادبی محاذ۔ دیوان بازار۔ کٹک۔ 753001

صلاح الدین تسکین کی غزلیہ شاعری

صلاح الدین تسکین کا تعلق اڑیسہ کے مردم خیز شہر کٹک سے ہے۔ وہ نئی نسل کے ایک جواں فکر شاعر ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں سے شعری سفر جاری ہے۔ انھوں نے اس سفر کا آغاز اس وقت کیا جب جدیدیت کا رحجان مقبول ہو چکا تھا۔ ابتدا میں میر کی پیروی اختیار کی۔ پھر ترقی پسندی، جدیت اور مابعد جدیدیت کے دور سے گزرتے ہوئے انھوں نے جہاں ان سبھی رحجانات سے اثرات قبول کیے وہیں اپنی ایک الگ راہ بھی نکالی۔ اس طرح ان کی شاعری پر کسی ازم کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شاعری دراصل کلاسک اور نو کلاسک کے درمیان ایک پُل کے مصداق ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں اگر ایک طرف جمالیات کی شبنمی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے تو دوسری طرف حالات کے سلگتے ہوئے صحرا کی تپش بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے شعری رویّے کے متعلق کہتے ہیں کہ:

یوں تو جدت ایک اچھی چیز ہے
کچھ روایت بھی پرانی چاہیے

ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے صاف پتہ چلتا ہے کہ روایت کی پاسداری کے ساتھ انھوں نے تازہ ہواؤں کے لیے ذہن کا دریچہ بھی کھلا رکھا ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرح کی میانہ روی پائی جاتی ہے اور جو تہذیبی رویّوں سے گزرتے ہوئے اس زوال آمادہ معاشرے کے انسان سے ہمکلام ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اب تک کے جمع کیے ہوئے شعری اثاثے کو یکجا کر کے اپنا اولین مجموعہ "باغِ تصور" لے کر ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اس کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے۔ پھر ۱۲۲ رغزلیں اور آخر میں چند قطعات ہیں۔ سب سے آخر میں ایک نظم "مدرسہ سلطانیہ" ہے جس سے وہ منسلک ہیں اور اسے اپنا خراج پیش کیا ہے۔ صلاح الدین تسکین غزل کے شاعر ہیں۔ اس لیے یہاں ان کی غزلیہ شاعری ہی میری گفتگو کا موضوع رہے گی۔ اس مجموعے میں جو غزلیں ہیں ان کے مطالعہ سے ان کے احساسِ جمال، فکری طہارت، ملی و قومی جذبوں کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی، اخلاقی اور ملک کی بگڑی ہوئی صورتحال کا ایک واضح منظرنامہ ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ان کی شاعری زینہ بہ زینہ ارتقا کی منزلیں طے کرنے لگی ہے۔ سب سے پہلے ہم ان کے احساسِ جمال پر نظر ڈالتے ہیں۔ پیروئ میر کے تحت کہے گئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ہریالی مہکتی تھی ہر سمت تری خاطر ۔ تو روٹھ گیا جب سے سوکھا سا ہے گاؤں میں
ان کی یادیں ہیں بکھری ہوئی آج تک۔ دل کی دہلیز پر روشنی کی طرح
جس کو میں بھول چکا تھا کبھی برسوں پہلے۔ کوچۂ دل میں وہی رات کی رانی آئی

اور اپنی ذات کے محفوظ جزیرے سے باہر نکل کر جب وہ اپنے اردگرد نظر ڈالتے ہیں تو حالات کے تپتے ہوئے صحرا کی تمازت انھیں مضطرب کردیتی ہے۔ مسائل کی سنگینیاں الگ سے کچوکے لگاتی ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ اخلاقی، سماجی، سیاسی ناہمواریاں اور نسلی منافرت سے کثیف ہوتی ہوئی فضا میں گھٹن کا احساس کر کے ان کا قلم صفحۂ قرطاس پر شاعر کے مجروح احساسات کو اس طرح منتقل کرنے لگتا ہے:۔

یہاں جو دھوپ ہے نفرت کی ہر طرف تسکیں۔ چلو کہ پیار کی برسات کر کے دیکھتے ہیں
جب دھوپ دشمنی کی ستانے لگی انھیں۔ وہ دوستی کی ٹھنڈی گھٹا مانگ رہے ہیں
اب ہوس کے شہر سے دل بھر گیا۔ دکھ کے جنگل میں ٹھہرنے دے مجھے
بہاتا ہے لہو جو دیش میں معصوم لوگوں کا۔ اسی کو لوگ اپنی قوم کا سردار کرتے ہیں
جہالت کو ملا کرتی ہے گدی اب چناؤ میں۔ شرافت کا امیں لیکن الیکشن ہار جاتا ہے

ملک کے زہریلے ماحول نے مسلمانوں کی زندگی جس طرح اجیرن کر رکھی ہے اس کا ادراک ہر کسی کو ہے لیکن سبھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ اس کے سدِ باب کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا جاتا۔ بس وعدوں کے سبز باغ دکھایے جاتے ہیں۔ اس مایوس کن صورت حال کے پس منظر میں جب وہ اپنی ملت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کی بے حسی پر ملولِ خاطر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

ہمیشہ بے حسی کی قید میں رہتے ہیں ہم تسکیں
مگر دشمن ہماری تاک میں ہشیار بیٹھے ہیں

تب انھیں اپنے اسلاف کی یاد بھی ستاتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:۔

بھول بیٹھے جب سے ہم اسلاف کی تاریخ کو۔ اک حقیقت تھے مگر اب داستاں تک آگیے
جب سے بھلا چکے ہیں بزرگوں کی روایات۔ تسکین تب سے ہم بڑی رسوائیوں میں ہیں

دن کو دن اور رات کو رات کہنا ان کا شیوہ ہے اور حق بیانی و حق پسندی ان کی فطرت۔ اس ضمن میں دو شعر پیش ہیں:۔

حق بیانی کے لیے ڈرتا نہیں ہوں میں کبھی۔ ہاتھ میں لے کر قلم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
حق بات کہنے والا مجھے ہے عزیز تر۔ تو بھی جو ایک ایسا بشر ہے تو بات کر

بعض جگہ تلمیحات اور استعارات کا خوبصورت استعمال بھی ان کے یہاں پایا جاتا

عشق نے حسن کی عظمت کو بڑھا دی ورنہ   ایک مجنوں کے مقابل میں وہ لیلیٰ کیا ہے

ہے۔مثلاً:۔

جہالت منحرف اظہارِ حق سے
مگر ہاتھوں کے کنکر بولتے ہیں

کیوں ٹینک سے توپوں سے ڈراتے ہو ہمیشہ
کیا تم نے ابا بیلوں کا لشکر نہیں دیکھا

مری تسکین کی حسین تتلی
اب مجھے کیوں نظر نہیں آتی

بزدلوں کی سلطنت بیکار ہے
حوصلوں کی حکمرانی چاہئے
ظلمتوں کی بھیڑ میں
روشنی کا میر ہوں

ان اشعار میں ہاتھوں کے کنکر اور ابابیلوں کا لشکر جہاں تلمیحی اشارات ہیں وہیں تسکین کی حسین تتلی، بزدلوں کی سلطنت، حوصلوں کی حکمرانی، ظلمتوں کی بھیڑ اور روشنی کا میر جیسے استعارات سے شعروں میں نہ صرف تہہ داری آئی ہے بلکہ ان کے شاعرانہ جمال کی ہنرمندی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اب تک کی باتوں کو اگر سمیٹا جائے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان کی شاعری کی بنیاد سلاستِ زبان وبیان اور جذبے کی صداقت وطہارت پر استوار ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس میں جمالیات کی جاذبیت بھی ہے تو سماجیات کا وسیع تر منظر نامہ بھی پایا جاتا ہے۔ مختصراً کہنا چاہوں گا کہ انھوں نے عام واقعات وسانحات سے زندگی کی حرارت کشید کر کے اپنی شاعری کو اپنے عہد کا اشاریہ بنادیا ہے۔ چونکہ یہ ان کا پہلا پڑاؤ ہے اور یہاں تک آنے میں انھوں نے جو ریاضت کی ہے اس میں کچھ کسر باقی رہ جانے کا امکان وہ بعید از قیاس تصور نہیں کرتے۔ مگر اتنی بات ہے کہ وہ اپنی شاعری کے تعلق سے پر امید ہیں اور مستقبل میں مزید بہتری کی توقعات رکھتے ہیں جس کا اظہار خود انھیں کے الفاظ میں دیکھئے:۔

اشعار ٹوٹے پھوٹے کہتا ہوں آج تسکینؔ
میری غزل بھی ہوگی روشن مثال اک دن

ناچیز کے خیال میں ان کی یہ توقعات بے جا نہیں ہیں۔ ان کی شاعری کے تیور سے ان کے روشن مستقبل کی پیش قیاسی کی جاسکتی ہے۔ یقین واثق ہے کہ صلاح الدین تسکین کی یہ اولین کاوش ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی جائے گی۔ میری دعا ہے کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

☆☆☆

ڈاکٹر قمر الزماں
SBI,M.T.P.S, DVC Colony
Bankura-722183(W.B)
Mob-09431914014

ہزل

جو پوچھے بھی تو کیا کوئی دلِ رنجور سے پوچھے
اگر پوچھے تو سچ پوچھو کسی مسرور سے پوچھے
کوئی جو جاننا چاہے کہ ہوتی کیفیت کیسی
تپش بگڑے مزاجِ یار کی تنّور سے پوچھے
یہاں اب پوچھنے کا بھی ادب باقی نہیں یکسر
کوئی جب خیریت پوچھے تو تھوڑی دور سے پوچھے
بہت انگڑائی لیتا ہے مسلسل گنگناتا ہے
ہنر دن کاٹنے کا شہر کے مزدور سے پوچھے
جو ہم ہیں پوچھنے والے تو تم ہو پوچھنے والے
کہ کیا ہوتا ہے ان میں فرق کوئی غیّور سے پوچھے
جو پوچھے بھی تو کیوں پوچھے اگر پوچھے تو کیا پوچھے؟
ہمارا حال ظاہر ہے کسی لنگور سے پوچھے
کوئی پوچھے یا نہ پوچھے زماںؔ ہم تو بتائیں گے
وہ شولا پور سے پوچھے کہ سنگا پور سے پوچھے

غزل

بڑا ہی سنگ دل وہ شیرِ آدم خور ہوتا ہے
مگر مجبور ہوتا ہے وہ جب کمزور ہوتا ہے
نہ ہی اسباب پر انسان کا کچھ زور ہوتا ہے
مگر افعال کا اس کے جہاں میں شور ہوتا ہے
چھپاؤ لاکھ پردے میں کہ اندر سے کچل ڈالو
ابھر آتا ہے چہرے پر جو دل میں چور ہوتا ہے
جو گانا ہے تو گادو جو بھی چاہو جیسے بھی چاہو
جو چھیڑو راگ درباری تو دل پر زور ہوتا ہے
اسی انداز سے خوش بخت رہتا ہے زماںؔ گھر میں
خوشی سے ناچتا جنگل میں جیسے مور ہوتا ہے

صلاح الدین تسکینؔ کے تخلیقی نمونے

حمد و نعت

اے خدامیں دیکھتاہوں تیری قدرت کا سماں
جس طرف جاتی ہیں نظریں ہوزمیں یا آسماں
مالک و مختار تو ہے قادرِ مطلق بھی تو
تیری شانِ بے نیازی کا کروں کیسے بیاں
میرے مولا! تیری حکمت کا عجب انداز ہے
پانیوں کی تہہ میں تو نے رکھ دیا آتش فشاں
چاندتاروں کی جبیں کوتو نے دی ہے روشنی
بادلوں کی کوکھ میں رکھی ہیں تو نے بجلیاں
تو ہے رحمٰن الرحیم اور تو بڑا ستار ہے
وصف تیری کیا کروں تسلیم ہے عجز بیاں
کر عطا شادابیاں تسکینؔ کے ہر شعر کو
عمر بھر کرتا رہے وہ تیری قدرت کا بیاں

بزم میں جب مرے سرکار نظر آتے ہیں
ہر طرف عرش کے انوار نظر آتے ہیں
جب تصور میں ابھرتا ہے مدینے کا جمال
آپ کے روضے کے مینار نظر آتے ہیں
میں نے دیکھا ہے عجب حال یہ دیوانوں کا
عشق میں آپ کے سرشار نظر آتے ہیں
وہ مدینہ کی بہاروں کا سماں ہے جس میں
اس جگہ خلد کے گلزار نظر آتے ہیں
حشر کے روز شفاعت کی تمنا لے کر
سر خمیدہ وہ گناہ گار نظر آتے ہیں
پھرابھر آیا ہے آنکھوں میں مدینے کا جمال
میری تسکینؔ کے آثار نظر آتے ہیں

دل یہ چاہے شہہِ بطحا کا قصیدہ لکھوں
ان کی باتوں کو ہدایت کا صحیفہ لکھوں
روشنائی میں عقیدت کی ڈبو کر خامہ
رب کے محبوب کے اوصافِ حمیدہ لکھوں
جن کی توصیف بیاں کرتا ہے قرآن مبیں
مجھ میں یہ تاب کہاں ان کا سراپا لکھوں
تشنہ لب ہوتے ہیں سیراب انھیں کے در سے
ان کی چوکھٹ کو میں فیضان کا دریا لکھوں
جس میں آباد رہا کرتی ہیں یادیں ان کی
اپنے دل کو بہر حال مدینہ لکھوں
آرزو ہے یہی تسکینؔ ہر اک شام و سحر
ورقِ دل پہ درودوں کا وظیفہ لکھوں

غزلیات

تیری الفت کی قسم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
ایک پتھر کو صنم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی مرضی جناب
میری باتوں میں ہے دم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
حق بیانی کے لیے ڈرتا نہیں ہوں میں کبھی
ہاتھ میں لے کر قلم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
میں نے رکھا ہے صداقت کو سدا پیشِ نظر
ہو بھی جائے سر قلم جو کہہ دیا سو کہہ دیا
کردیا اظہار حق تسکینؔ میں نے شعر میں
چاہے کھل جائے بھرم جو کہہ دیا سو کہہ دیا

گر دل کی کیفیت ہے کی خبر ہے تو بات کر
دل جیتنے کا تجھ میں ہنر ہے تو بات کر
مقبول عام کرتی ہے شیرینیٔ زباں
تجھ میں بھی کوئی ایسا گہر ہے تو بات کر
جھوٹوں کے ساتھ رکھتا نہیں اپنا رابطہ
سچائی دیکھنے کی نظر ہے تو بات کر
حق بات کہنے والا مجھے ہے عزیز تر
تو بھی جو ایک ایسا بشر ہے تو بات کر
کیا سوچ کے تو سب پہ اُٹھاتا ہے انگلیاں
تسکینؔ تجھ کو اپنی خبر ہے تو بات کر

ہم ان کے ترش لہجے پر بھی خوش گفتار رہتے ہیں
ہمارا ظرف ہے کہ صاحبِ کردار رہتے ہیں
سکونِ دل میسر ہے ہمیں سادہ مزاجی سے
جو پیچ و تاب کھاتے ہیں وہی بیمار رہتے ہیں
ہمیں فرصت کا لمحہ ایک پل ملتا نہیں لیکن
وہ کیسے لوگ ہیں جو آج کل بے کار رہتے ہیں
غموں کا ذائقہ بھی لطف دیتا ہے ہمیں لیکن
بھلا کیوں زندگی سے آپ یوں بیزار رہتے ہیں
بلا کی موج سے بچ کر چلے آئے تو ہو تسکیں
کنارے پر بھی اکثر منتظر منجدھار رہتے ہیں

صلاح الدین تسکینؔ کے تخلیقی نمونے

غزلیات

وہ ہم پہ مہرباں تھے ابھی کل کی بات ہے
ہم لوگ شادماں تھے ابھی کل کی بات ہے
تھا اپنا آشیانہ بھی بامِ عروج پر
ہم مثل کہکشاں تھے ابھی کل کی بات ہے
آج وہ سمجھ رہے ہیں ہمیں غیر کس لیے
ہم ان کے رازداں تھے ابھی کل کی بات ہے
کہتے ہیں وہ چمن پہ ہمارا نہیں ہے حق
ہم جس کے باغباں تھے ابھی کل کی بات ہے
اب تو غبارِ راہ سے کم تر ہے زندگی
ہم میرِ کارواں تھے ابھی کل کی بات ہے
تسکینؔ مانگتا ہے ہمیں خونِ دل وہی
ہم جس کے پاسباں تھے ابھی کل کی بات ہے

آج پھر یاد جو اک شام سہانی آئی
پھر تصور کے گلستاں میں جوانی آئی
جس کو میں بھول چکا تھا کئی برسوں پہلے
کوچۂ دل میں وہی رات کی رانی آئی
پھول زخموں کے تروتازہ ہوئے ہیں اکثر
یاد مجھ کو جو کبھی چوٹ پرانی آئی
میرے احباب کی جانب سے جو آیے پتھر
میں نے سمجھا کہ محبت کی نشانی آئی
میرا ماضی مجھے یاد آ گیا تسکیںؔ اس دم
یاد الفت کی جو رنگین کہانی آئی

سنگ دل ہے، بے وفا ہے، بے مروت ہے تو ہے
لوگ کہتے ہیں مجھے اس سے محبت ہے تو ہے
دل چرانے کی ادا ان کی بہت ہے دل نشیں
چور کی داڑھی میں تنکا' یہ کہاوت ہے تو ہے
میرے دل میں اس کی الفت دوستو بے لوث ہے
اس کی نظروں میں اگر یہ بھی تجارت ہے تو ہے
دے رہا ہوں اپنا دل اس کو جو چاہے وہ کرے
ہنس کے دل کو توڑ دینا اس کی عادت ہے تو ہے
منتظر رہتا ہوں اس کا ہر گھڑی اس موڑ پر
دیکھ کر منہ پھیر لینا گر نزاکت ہے تو ہے
مجھ کو ہے تسکینؔ کہ میں بانٹتا رہتا ہوں پیار
آپ کے دل میں اگر مجھ سے عداوت ہے تو ہے

ہے کیسی کشش یارو ان ترچھی نگاہوں میں
کیا جانے لٹے کتنے مستانہ اداؤں میں
ساون کی حسیں رُت میں سج دھج کے وہ نکلے ہیں
اب آگ لگا دیں گے ان بھیگی فضاؤں میں
تشریف وہ لائیں گے، یہ بات سنی جب سے
روشن ہیں امیدوں کے یہ دیپ نگاہوں میں
ہریالی مہکتی تھی ہر سمت تری خاطر
تو روٹھ گیا جب سے سوکھا سا ہے گاؤں میں
اک بھول ہوئی ہم سے جو دل ان کو جو دے بیٹھے
اس دن سے تڑپتے ہیں الفت کی گپھاؤں میں
واللہ کبھی آ کر حالت تو ذرا دیکھو
جکڑا ہوا تسکیںؔ ہے تکلیف کی باہوں میں

دل شکن درد کی تفسیر کہاں سے آئی
میری قسمت کی یہ تحریر کہاں سے آئی
میں نے پلکوں پہ سجایا تھا حسیں خواب مگر
اس کی یہ دکھ بھری تعبیر کہاں سے آئی
ہم تو دیتے رہے دنیا کو محبت کا پیام
درمیاں اپنے یہ شمشیر کہاں سے آئی
میں نے احساس کے زخموں کو چھپا رکھا ہے
دل میں پھر درد کی تصویر کہاں سے آئی
سب کو اپنا وہ بنا لیتا ہے پل میں تسکینؔ
''اس کی باتوں میں یہ تاثیر کہاں سے آئی''

سمجھ سکے جو مرا مدعا نہیں آیا
دکھانے رستہ کوئی رہنما نہیں آیا
ہے انتظار مجھے جس کا ایک مدت سے
مری خوشی کا وہی سلسلہ نہیں آیا
خدا کا فضل ہے باقی ہے دوستی اپنی
ہمارے بیچ کبھی فاصلہ نہیں آیا
میں جس کے ساتھ چلا جاؤں اپنی منزل تک
مرے نصیب میں وہ قافلہ نہیں آیا
مٹا سکے جو دلوں سے خیالِ رنجش کو
''ہمارے سامنے وہ راستہ نہیں آیا''
ہمیشہ سچ کی حمایت جنھوں نے کی تسکیںؔ
انھیں کے حق میں کبھی فیصلہ نہیں آیا

شاہد بخاری
لاہور۔ پاکستان

ایک حساس دل شاعر....وصی مکرانی

مدیر"ادبِ لطیف" نے" بک کلب لاہور"میں یہ اشعار سنا کر شاعر کا نام پوچھا؟

ملا سرکار سے تمغہ اسی کو۔تصادم جس نے کروایا بہت تھا
نہ مانا اور کر بیٹھا محبت ۔ دل ناداں کو سمجھایا بہت تھا
گیا وہ بھی یہاں سے ہاتھ خالی۔ کہ جس کے پاس سرمایہ بہت تھا
ہوا جب سے کمبخت گلشن کا مالی ۔سبھی برگ وگل پیلے پڑنے لگے ہیں
سچ کو صلیب ودار پر لٹکا دیا گیا ۔ ہر سو ہے گرم جھوٹ کا بازار آج کل

کوئی بھی حاضرین میں سے ان اچھے اشعار کے خالق کا نام نہ بتا سکا۔ حتیٰ کہ ناصر زیدی صاحب بھی خاموش بیٹھے رہے جو اکثر مصرع سن کر دوسرا مصرع اچھے شعر کا فوراً سنا دیتے تھے۔ مدیر"ادبِ لطیف" صدیقہ بیگم نے یہ بتلا کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا کہ یہ پاک وہند کے شاعر کا کلام نہیں بلکہ نیپال کے وصی مکرانی واجدی کے اشعار ہیں جو ۷رجولائی ۱۹۵۷ءکو نیپال کے ایک مردم خیز گاؤں کے"بھانٹرسر" کے ایک ذی مرتبت علمی خانوادے میں پیدا ہوئے۔علاج ومعالجہ کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہے۔آج کل نجی کاروبار سے منسلک ہیں۔ادبی شغل بھی جاری ہے۔ان کے تین نعتیہ مجموعوں کے نام ہیں"کہکشاں"،"سامانِ جنت"،"لعل وگہر"۔تازہ مجموعہ"ٹوٹے ہیرے بکھرے موتی" حمد ونعت' غزل وقطعات پر مشتمل ہے۔جس کے فلیپس پر وائس چیرمین اردو اکاڈمی دہلی پروفیسر قمر رئیس اور فاؤنڈر ڈائرکٹر محمد نسیم نورانی نے لکھے ہیں۔پروفیسر احتشام اختر' سعید رحمانی ایڈیٹر اخبار اڑیسہ' ڈاکٹر راشد عزیز نائب ایڈیٹر ایوان اردو دہلی' علامہ مفتی عبدالغفار ثاقب کے سیر حاصل مضامین سے یہ مجموعہ مزین ہے۔رسولِ پاک سے گہری عقیدت ومحبت نے ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی سے بہت خوب صورت نعتیہ اشعار کہلوایے ہیں۔

دیکھنا جس شہر کا منظر ہے معراجِ حیات۔دیکھیے میرا وہاں ہوتا ہے جانا اور کب
جانے کب بیدار ہوگا قوم مسلم کا شعور۔طاق سے نکلے گا الفت کا صحیفہ اور کب
پھر سے مل جل کر رہیں ہم لوگ بھائی کی طرح۔ دور ہوگا نفرتوں کا یہ اندھیرا اور کب
دہر سے بے رہ روی کو دور کرنے کے لئے۔ لے کے آیے آپ وہ آئینِ قدرت کا چراغ

نیپال میں اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے وصی مکرانی نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔وہ مختلف علمی وادبی' سماجی وسیاسی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ ہیں۔"کائنات سخن" کے بانی وصدر ہیں۔آپ غزل میں شعبدہ گری اور لفظی کرتب بازی کو پسند نہیں کرتے۔انھیں غزل کی کلاسیکی روایات بہت عزیز ہیں اور وہ ان کا بہت احترام کرتے ہیں۔وصی مکرانی نے غزل کی شعری روایات کی توسیع وتجدید میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان کے کلام میں فنی پختگی وچابک دستی اور تہہ داری' کلاسیکی روایت کی پاسداری'اس کے احترام اور گہرے لگاؤ کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔وصی مکرانی کلاسیکی شعری روایت کے نمائندہ شاعر ہیں۔اشعار محولہ بالا جو شروع ہی میں درج ہیں ان کے غزلیہ اسلوب کی انفرادیت کا اندازہ آپ کر چکے ہوں گے۔پروفیسر احتشام اختر نے درست لکھا ہے کہ وصی مکرانی کی غزلوں میں حسن تغزل کی گہرائی و گیرائی اور شعریت بدرجہ اُتم موجود ہے۔ساتھ ہی عصری آگہی اور سیاسی وسماجی بصیرت بھی پائی جاتی ہے۔غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی آمیزش سے انھوں نے اپنی غزل کے رنگ ڈھنگ سنوارے ہیں۔ڈاکٹر وصی مکرانی کی تحریروں اور تقاریب کے انعقاد سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیپال میں بھی اردو کے ڈانڈے دکن کی قدیم روایات سے بہر طور جڑے ہوئے ہیں۔وادئ نیپال کے ایک دور دراز گاؤں میں رہ کر اس پایہ کا ادب تخلیق کرنے والے فن کار نے خود اپنی ذات میں ایک شہر شعر وسخن آباد کر لیا ہے جس کی ہر گلی کوچے میں اہل قلم کی محفلیں سجتی ہیں۔"ٹوٹے ہیرے بکھرے موتی" میں ڈاکٹر وصی مکرانی کی شاعری پایۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے جہاں ہیرے کی چمک بھی ہے اور موتی کی دمک بھی۔شعری اظہار میں پاکیزگی' برجستگی اور روانی کے ساتھ الفاظ ومعانی پر ان کی پوری ماہرانہ گرفت ہے۔ان کی غزلوں میں نئی نزاکت اور جذبوں کی صداقت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر وصی مکرانی کی غزلوں میں روایت وجدیدیت کا ایک حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔کچھ غزلوں کی فضا خالص رومانی ہے جس پر ان کا احساس جمال حاوی نظر آتا ہے۔

میرے محبوب نے زلفوں کو بکھیرا تو نہیں۔موسمِ سرد میں برسات کہاں تھی پہلے
چھٹ جائے گا تاریکئ شب گیر کا بادل۔چلمن کو ذرا رُخ سے اٹھا کیوں نہیں دیتے
کاکل شب رنگ نہ بکھرایئے۔دامنِ دل تار ہوگا آج پھر
کہتے ہو اگر تم مجھے ممتاز محبت ۔اک تاج محل مجھ کو بنا کیوں نہیں دیتے
جذبۂ عشق ہو پیدا تو غزل ہوتی ہے۔ہو جو دل حسن پہ شیدا تو غزل ہوتی ہے
جب کسی شوخ حسینہ کے حسیں چہرے سے۔ اٹھتا ہے ریشمی پردہ تو غزل ہوتی ہے

وصی مکرانی واجدی ایک حساس دل انسان ہیں۔ہمیشہ خوشی کے ساتھ مسکرا کر جینا چاہتے

(بقیہ صفحہ پر)

ڈاکٹر آفاق فاخری
Jalalpur.Ambedkar-224149
(U.P)موبائل:۔09918617576

ساغر نظامی کی نثر نگاری.........تجزیہ وانتخاب' ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد زاہد عصر حاضر میں اردو زبان وادب وتحقیق اور تخلیقی تناظر میں نئی نسل کی معیاری اور پُر وقار نمائندگی کرتے ہیں۔ادبی ذوق انھیں وراثت میں ملا ہے۔ان کے والد بزرگوار حضرت صادق رائے بریلوی (مرحوم) اردو زبان کے قادر الکلام شاعر گزرے ہیں۔جن کی نگارشات کثیر الجہت اور متنوع ہیں۔ڈاکٹر زاہد عصری علوم سے آراستہ وپیراستہ شخصیت کے حامل ہیں۔ادب کے ساتھ ساتھ صحافت بھی ان کی دلچسپیوں کے میدان ہیں۔تصنیف و تالیف سے انھیں خاص شغف ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۲۰۰۳ء میں ان کے مضامین پر مشتمل تصنیف ''لفظوں کے چراغ'' اور ۲۰۰۷ء میں ''صادق رائے بریلوی.........کلام وفن'' کے عنوان سے ان کی تالیف زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آئی اور اسے ارباب علم ودانش نے تحسین وتبریک سے نوازا۔اسی ذیل میں ڈاکٹر محمد زاہد کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ بعنوان ''ساغر نظامی کی نثر نگاری.........تجزیہ و انتخاب'' شائع ہو کر کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔یہ تحقیقی مقالہ اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔

چونکہ حضرت ساغر نظامی ہماری اردو شاعری میں ایک معروف' مستند اور قادر الکلام شاعر کے طور پر اپنی الگ شناخت اور منفرد وممتاز مقام رکھتے ہیں۔ڈاکٹر زاہد نے ساغر نظامی کی نثر نگاری کا جو تجزیہ وانتخاب قلم بند اور یکجا کیا ہے وہ اپنی جگہ پر ایک اہم اور نمایاں کارنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد زاہد نے اپنی کتاب ''ساغر نظامی کی نثر نگاری'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔حصہ اول کا پہلا باب ساغر نظامی کی سوانح حیات پر مشتمل ہے جس کے تحت انھوں نے سماجی وثقافتی پس منظر' تعلیم' شخصیت وراہِ زندگی کے آخری ایام اور انعامات واعزازات کے عنوانات سے پُر از معلومات باتیں قلم بند کی ہیں۔دوسرا باب ساغر نظامی کی نثر نگاری کا ناقدانہ جائزہ ہے۔اُس کے تحت 'ساغر نظامی بحیثیت دیباچہ نگار'، 'ساغر نظامی بحیثیت اداریہ نگار'، 'ساغر نظامی بحیثیت تنقیدی مضمون نگار'، 'ساغر نظامی بحیثیت ریڈیائی فیچر نگار'، 'ساغر نظامی بحیثیت ریڈیائی ڈرامہ نگار'، 'ساغر نظامی بحیثیت فکشن رائٹر'، 'ساغر نظامی بحیثیت مکتوب نگار اور ساغر نظامی کی دیگر نثری تحریریں جیسے عناوین پر تفصیلی جائزہ اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔بہ الفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تجزیاتی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اپنے عنوانات کا حق ادا کیا ہے۔ڈاکٹر محمد زاہد کی اس کتاب کا حصہ دوم ساغر نظامی کی نثری تحریروں کا نمائندہ انتخاب ہے۔اسی حصہ میں ''روحِ مکاتیب کا دیباچہ'' اور منظوم ڈرامہ ''انار کلی'' کا دیباچہ جیسے عنوانات کے تحت ذیلی عنوانات قائم کر کے دلکش طرز اظہار میں اپنے تاثرات کو قلم بند کیا ہے۔جس میں دلکشی اور جاذبیت کے ساتھ ساتھ لطافت اور شگفتگی بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ساغر نظامی کے اداریوں کے تحت انھوں نے ہفتہ وار علی گڑھ پنچ کا اداریہ' ہفت روزہ ''استقلال'' کا اداریہ' ماہنامہ پیمانہ آگرہ کا اداریہ' ماہنامہ ایشیا کا اداریہ اور ماہنامہ پرچم کا اداریہ کے عنوانات سے نہایت گراں قدر سرمایہ کو یکجا کر دیا ہے جس میں عصری حسیت اور عصری آگہی کی بھرپور جلوہ گری ہے۔ساغر نظامی کے ادبی مضامین ریڈیائی فیچر' ڈرامے' افسانے اور چند اہم مکتوبات کو اس کتاب میں شامل کر کے گویا ڈاکٹر زاہد نے اردو ادب کے گراں قدر اور قیمتی اثاثے کو محفوظ کر دیا ہے۔اسے بہر حال ان کا اہم اور نمایاں کارنامہ کہا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر زاہد کی یہ تصنیف اپنے اسلوب' بیان او رطرز ادا کے باعث سلاست' روانی' شائستگی' شگفتگی' دلکشی اور جاذبیت کا خوبصورت مرقع تصور کی جایے گی۔یہ کتاب تحقیق' تنقید' تجزیے اور تبصرے کی دلکش دستاویز ہے۔اس کے لیے موصوف کو مبارک باد اور ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔☆☆☆

(ایک حساس دل شاعر۔وصی مکرانی کا بقیہ)

ہیں۔زمانے کی ستم ظریفی' حالات کی سنگ دلی' اپنوں کی بے اعتنائی اور غیروں کی بے مروتی سے دل برداشتہ ہوکر اپنے احساسات کو کس سلیقے اور ہنر مندی سے اپنے اشعار میں پیش کرتے ہیں۔دیکھیے ؎

ہے یہ شہر پتھروں کا یہاں لوگ سنگ دل ہیں۔چلو زخم دل دکھائیں کہیں اور جا کے ہم بھی
غمِ زندگی بھی کوئی یہاں بھیک میں نہ دے گا۔کریں سکھ کی التجائیں کہیں اور جا کے ہم بھی
کوئی پیار سے یہاں پر وصی بولتا نہیں ہے۔چلو چل کے مسکرائیں کہیں اور جا کے ہم بھی

وصی صاحب نے جس شعر کے معنی ومفہوم کے نام اس کتاب کو منسوب کیا ہے۔اسی شعر کے ساتھ میں اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں۔؎

کدورت دل میں ہو تو اپنے بیگانے سے لگتے ہیں
محبت دل میں ہو تو لگتا ہے سارا جہاں اپنا

☆☆☆

سید بصیرالحسن وفاؔ نقوی
Hilal House.H.No.4/114
Nagla Mallah CiVil Line
Aligarh UP

محمد وصی بیگ بلاؔل علیگ کے مجموعۂ کلام ''پیاسا دریا'' کا تنقیدی مطالعہ

محمد وصی بیگ بلاؔل علیگ ایک نوجوان اور خوش فکر شاعر ہیں ان کا وطنِ مولود حیدرآباد تلنگانا ہے لیکن وہ علی گڑھ جیسی علمی و ادبی سرزمین میں پروان چڑھے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور اب شاہجہاں پور میں ایک کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ انتہائی مصروف زندگی کے باوجود انھوں نے ادب کے لئے خصوصاً شاعری کے لئے وقت نکالا اور دنیائے ادب کو ''پیاسا دریا'' کے نام سے اپنا مجموعۂ کلام بھی دیا۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ ایک وہ شخص جس کا میدان سائنس ہو اُس نے اردو زبان و ادب کو اپنے فن کے مظاہرے کے لئے انتخاب کیا۔ یہ سب ان کے گھر کے ماحول اور مادرِ درس گاہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ملی ہوئی تعلیم و تربیت اور ادبی فضا کا ثمرہ ہے۔ انھوں نے یہاں کے ادبی ماحول سے اپنے فن کو نکھارا اور شعر و شاعری کی صورت میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر کے اپنے معاشرے میں شہرت حاصل کی۔ ان کی شعری پرواز کو اُس وقت مزید بلند پرواز عطا ہوئی جب انھوں نے حمید خضرؔ شاہجہاں پوری کی شاگردی اختیار کی۔ اس کے بعد انھیں بخوبی اندازہ ہوا کہ شاعری کا اصل شعور کیا ہے اُس کی نوک و پلک کس طرح سنورتی ہے اور شعر کو زیادہ سے زیادہ متاثر کن کس طرح بنایا جاتا ہے۔

اہلِ ادب کے لئے خوشی کا مقام ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات کو یکجا کیا اور ''پیاسا دریا'' نام دیا۔ اس مجموعۂ کلام سے جہاں ان کی فکر اور جذبات کی عکاسی ہوتی ہے وہیں اُن کی شخصیت کا بھی کسی حد تک اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پیچیدگی سے دور ہے اُس میں بھاری بھرکم الفاظ نہیں وہ سادہ گو ہیں سادگی اور سلاست اور سہلِ ممتنع کے پیرائے میں اپنی بات کہنے کا ہنر خوب جانتے ہیں مثلاً:

کس زمانے کی بات کرتے ہو۔ دوستی اب کہاں جہان میں ہے

زمانے کی تلخ حقیقت کو سادگی کے پیرایے میں پیش کرنے کا ہنر ہر کسی شخص کو نہیں ملتا۔ بہت سے شعراء اپنی علمی لیاقت دکھانے کے لئے شعر کو ایسے الفاظ سے پُر کر دیتے ہیں جن کی تشریح میں وقت لگتا ہے اور دقت محسوس ہوتی ہے بعض مرتبہ قاری یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شعر ہے یا پہیلی ہے۔ لیکن جو زمانہ شناس شعراء ہوتے ہیں وہ اپنے قاری کو دقت کا شکار نہیں ہونے دیتے بلکہ ان کی شاعری کا ایسا انداز ہوتا ہے کہ ہر مزاج کا قاری اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہتا۔ بلاؔل علیگ صاحب اس سلسلے سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب کی کلاسیکی تہذیب سے متاثر ہیں ان کے یہاں بھی عشق کا جذبہ اور زلف و لب و رخسار کا ذکر ہے وہ بھی محبوب کے دستِ حنائی پر فدا ہیں اور بہت سے روایتی مضامین کے ساتھ اپنی شاعری میں اپنے جذبات کی پیش کش کرتے ہیں لیکن انھوں نے اس سلسلے سے تجاوز نہیں کیا بلکہ ان کے یہاں ایک سلیقہ اور شائستگی ہمیشہ نظر آتی ہے چند اشعار دیکھیں:

زینت کسی کے دستِ حنائی کی یوں بڑھی۔ ہے آرزو کا خون بھی شامل حنا کے ساتھ

تو اپنی زلف کے سایے میں کرنے دے آرام۔ تھکا ہوا ہوں مسافر وفا کی راہوں کا

جو آشیاں بنایا ہے ہم نے بہ ذوق و شوق۔ پھونکیں گے اس کو برق و شرر جانتے ہیں ہم

مذکورہ اشعار میں ''دستِ حنائی'' ''زلف کے سایے'' ''آشیاں'' جیسے الفاظ کلاسیکی اُردو غزل کے عکاس ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر روایتی غزل سے دامن تہی نہیں رکھتا لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بلاؔل کے یہاں نئی غزل کا انداز یا مضامین نہیں ان کے یہاں ہمعصر شعراء کا اندازِ بیان بھی واضح طور پر نظر آتا ہے جس میں خوبصورت علامتوں اور استعاروں کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس طرح کہ اُس پر یہ گمان نہیں ہوتا کہ انھوں نے یہ انداز کسی سے نقل کیا ہے۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے یہاں پرانی علامتوں سے نئے مضامین کو جلوہ گر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً:

جانے کیا کہہ دیا ہے تتلی نے۔ شاخ پر پھول مسکرایا ہے

کسی بھی دن مجھے لے جایے گی اُڑا کے ہوا۔ ہوں ایک سوکھا ہوا گل چمن کے ہاتھوں کا

حوصلہ ہارے نہیں اس لیے پایا ساحل۔ کتنے طوفاں اُٹھے کشتی کو ڈبونے والے

پیش کیے ہوئے مذکورہ اشعار میں وہی علامتیں استعمال کی گئی ہیں جنھیں دوسرے شعراء نے بھی اپنا مطمحِ نظر بنایا ہے۔ یعنی تتلی، شاخ، پھول، ہوا، گل،

چمن، ساحل، طوفان، کشتی، وغیرہ۔لیکن بلاآل علیگ کے یہاں کچھ نیا پن بھی نمودار ہوتا ہے اور یہ نیا پن ان کی سادگی اور سلاست سے مل کر قارئین کو متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔اس طرح عصری شاعری سے متاثر کچھ اور اشعار دیکھیں:

سب اپنی ذات کے بارے میں سوچتے ہیں یہاں۔ بناوٹی ہے ہر اک رنگ رشتے ناتوں کا
ہر بُرے وقت میں ہم جس کے مددگار رہے۔کب یہ سوچا تھا وہ دشمن کی گواہی دے گا
ہر مسافر دعائیں دے کے گیا۔اک شجر راہ میں لگایا تھا

یعنی ''رشتے داروں کا بناوٹی رنگ'' ''برے وقت میں جس کی مدد کی گئی اُس کا دشمن کی طرف سے گواہی دینا'' اور ''شجر راہ میں لگانا'' پرانے مضامین ہو سکتے ہیں لیکن جو بات یہاں متاثر کرتی ہے وہ کہنے کا اسلوب ہے۔بلاآل علیگ نے حالاتِ حاضرہ کی تلخیوں کو جس طرح شاعری کے پیرائے میں بیان کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کی تصویر اپنے پیشِ نگاہ رکھتے ہیں اور اس تصویر کے مٹتے ہوئے رنگوں پر اپنا ردِّ عمل بھی پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں طنز کے نشتر بھی پائے جاتے ہیں مثلاً:

سب حادثے کی سن کے خبر دیکھنے کو آیے۔تم کو کسی نے دی نہ خبر جانتے ہیں ہم

طنز کے علاوہ ان کی غزل میں حق و باطل کا امتیاز بھی نظر آتا ہے جس کی مثال میں وہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں جو انھوں نے واقعۂ کربلا سے متاثر ہو کر کہے ہیں۔مثلاً:

باطل کا کون حق کا طرفدار کون ہے۔کس کا سجے گا نیزے پہ سر جانتے ہیں ہم
یا د رکھنا ہیں کربلا والے۔ذکرِ آبِ فرات کرتے رہو

کربلا کا سانحہ ہر دور کے لئے حق و باطل میں امتیاز قائم کرتا ہے یہ ایک علامت کی شکل میں دنیائے ادب کا سرمایا بنا ہوا ہے اور کوئی بھی حساس شاعر اس واقعے سے گریز نہیں کرسکتا لہٰذا بلاآل علیگ بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔

ان کے یہاں ماضی کی یاد اور اس کی کسک بھی پائی جاتی ہے وہ علامتوں کے ذریعے اپنے سماج کی کھوئی ہوئی اقدار کا بھی ذکر کرتے ہیں کہتے ہیں:

راہ میں پرکھوں کی عظمت کا نشاں ملتا نہیں۔اب جو پیاسا ہو مسافر تو کنواں ملتا نہیں
گاؤں جیسی روٹیاں پکتی نہیں ہیں شہر میں۔جس جگہ بھی جاؤ چولہے کا دھواں ملتا نہیں

جہاں ان کی شاعری سادگی اور دلچسپ اندازِ بیان سے معمور ہے وہیں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے چھوٹی بحروں میں بھی غزلیں کہی ہیں جس سے ان کی صلاحیت کا مزید لوہا مانا جاسکتا ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر ہیں لیکن وہ غزلیں دوسری غزلوں کے مقابلے میں پوری توانائی کے ساتھ اپنے وجود کی طرف مائل کرنے میں قاصر رہتی ہیں پھر ان کے یہاں ایسے قوافی بھی آ گئے ہیں جو ادبی نقطۂ نگاہ سے اس قدر مقبول نہیں جس انداز میں انھیں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے مثلاً:

شیر کی طرح وہ دہاڑ گیا۔آج کانوں کے پردے پھاڑ گیا
اب پریشاں ہیں قافلے والے۔سب طنابیں کوئی اُکھاڑ گیا

یعنی ''دہاڑ' پھاڑ' اور اُکھاڑ وغیرہ جیسے قوافی ادب میں اس حیثیت کے حامل نہیں جس طرح دیگر قوافی ہوتے ہیں کیونکہ ''ڑ'' ایک ایسا حرف ہے جو وادئ شعر و سخن میں خارزار کا کام کرتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ بلاآل علیگ ایک صاف گو اور سادہ مزاج شاعر ہیں ان کا کلام اثر سے خالی نہیں ان کا مجموعہ ''پیاسا دریا'' ایک گلدستے کی مانند ہے جس میں کچھ اشعار روایت سے متاثر ہیں کچھ اشعار جدید انداز کے حامی ہیں کچھ اشعار ماضی کی طرف متوجہ کرتے ہیں تو کچھ اشعار آنے والے زمانے کی خبر دیتے ہیں۔یہ ان کا ادب کی راہ میں نقشِ اول ہے جس کو پڑھنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام اہلِ نقد و نظر کو زیادہ سے زیادہ متاثر کرے گا اور آنے والے دنوں میں ان کی شاعری مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضی امروہوی۔بانی علامہ قیصر اکیڈمی۔علی گڑھ
آباد مارکیٹ دودھ پور علی گڑھ
موبائل:9897601669

نذرِ روحِ جگر

اب نہیں بھرنا پڑے گا کوئی ہرجانہ مجھے
آ گئے ہیں دوستو آدابِ میخانہ مجھے

تم ہی لوگوں کے سکھائے ہیں مرے سارے ہنر
آ گیا ہے مرغیوں کو ڈالنا دانہ مجھے

کر دیا دو مرغوں ہی میں مولوی جی نے یہ کام
مل گئی فرزانہ اُس کو اور رضوانہ مجھے

اب تو جی بھر کر پیوں گا اس کی آنکھوں کی شراب
آ گیا ہے جام سے اب جام ٹکرانا مجھے

چار دن میں لے کے بیٹے کو وہ چمپت ہوگئی
کس قدر مہنگا پڑا گھر میں بہو لانا مجھے

آتے ہی بیوی نے گھر بچوں سے میرا بھر دیا
اب ڈرا دیتا ہے اس کے جی کا متلانا مجھے

ساس سالی اور سُسر تو مر گئے تھک ہار کر
تم بھی سالو چھوڑ دو اب روز دھمکانا مجھے

کل تلک جو لوگ مجھکو لفٹ بھی دیتے نہ تھے
اب رضی وہ کہہ رہے ہیں میرِ میخانہ مجھے

پروفیسر (ڈاکٹر) عشرت آراء سلطانہ
دائرہ، بہارشریف، نالندہ۔ 803101
(بہار) انڈیا

افسانہ ”کربلا“ حقیقت کے آئینے میں

اردو کے تخلیقی ادب میں صنف افسانہ نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ یوں تو اردو دنیا میں اس کی بہت قدیم تاریخ نہیں ہے پھر بھی یہ کم و بیش سو سال کی ہو چکی ہے۔ چونکہ ارضِ بہار کے اردو اہل قلم نے قومی طور پر ظہور پذیر ہونے والی ہر تحریک اور ہر صنف کا ساتھ بہت ہی فراخ دلی کے ساتھ دیا ہے اس لیے صنف کی ابتداء اور ارتقا سے آج تک یکساں طور پر اپنا حق ادا کیا ہے۔ سرزمین بہار واقعی ادبی خدمات کے لحاظ سے انتہائی زرخیز اور فعال رہی ہے۔ جب صنف افسانہ نگاری کا چلن قومی طور پر عام بھی نہیں ہوا تھا، اس وقت سے اہل بہار نے اس کے تئیں اپنی رغبت کا اظہار کیا اور اپنے تخلیقی عمل سے اس کے سرمایے میں اضافے کے لئے حتیٰ وسع سعئ بلیغ فرمائی۔ بہار کے اولین افسانہ نگار ہونے کا شرف علی محمود کو حاصل ہے۔ یہ عہد قریب ۱۹۴۰ء کا ہے یا اس کے قریب کا۔ حالانکہ اس سے قبل ”انگارے“ کے نام سے افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا تھا۔ لیکن اس مجموعہ کے مشمولات میں شامل کہانیوں کو مکمل افسانہ ہونے کا شرف حاصل نہیں تھا۔ پھر بھی اس مجموعہ کی کہانیوں کو اردو افسانہ کی اساس ہونے کا شرف ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان کہانیوں میں کوئی متعین تکنیک کا استعمال عمل میں نہیں آیا تھا۔ پھر بھی کہانیوں میں کہانی پن اور اور ان کا بیانیہ انھیں افسانے کی اولین صورت تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ بہر حال ”انگارے“ سے جو سلسلۂ افسانہ نویسی شروع ہوا، وہ انتہائی کم مدت میں بتدریج ارتقائی منازل طے کرتے کرتے آج بام عروج پر ایستادہ نظر آتا ہے۔ اس صنف ادب کو اس بلندی تک پہنچانے میں بہار کے اہل قلم کا بھی نمایاں کردار رہا ہے۔ یہاں افسانہ نگاروں کی ایک کثیر تعداد آج بھی نظر آتی ہے، یعنی وہ ماضی ہو یا حال بہار نے اس میدان عمل میں ہر دور میں اپنا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ بہار کے ایسے ہی مخلص افسانہ نگاروں میں ایک نام انور امام کا ہے۔ جن کا آبائی وطن الہ آباد ہے۔ لیکن آپ شہرِ آہن جمشید پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی جو فی زمانہ ریاست جھارکھنڈ کا ایک بہت ہی مستحکم اقتصادی و صنعتی مرکز ہے۔ ویسے آپ نے جب اپنے قلم کو حرکت دی اس وقت مذکورہ شہر صوبہ بہار کا ہی حصہ تھا۔ جو ۲۰۰۰ء کی تقسیم بہار کے باعث نو آموز ریاست جھاڑکھنڈ کے حق میں چلا گیا۔ بہر کیف! آدمی جہاں پیدا ہوتا ہے، نشو و نما پاتا ہے وہ وہیں کا کہلاتا ہے، چنانچہ انور امام گو کہ آج جھارکھنڈ ریاست کے شہری ہیں لیکن انھیں حقیقتاً بہاری ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یوں تو ہمیں موصوف کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں.... ہم آج دہلی اردو اکاڈمی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ”ایوان اردو“ کے اگست ۲۰۱۶ء کا شمارہ کی ورق گردانی کر رہے تھے تو نگاہ انور امام کے افسانہ ”کربلا“ پر جا کر مرکوز ہو گئی۔ چونکہ ہمیں افسانے کے مطالعہ کا شوق عہد طفلی سے رہا ہے چنانچہ دیگر افسانوں کے علاوہ انور امام کا افسانہ ”کربلا“ کا مطالعہ بھی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ضروری تصور کیا اور ایک نشست میں پوارا افسانہ پڑھ گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانے کے بحر بیکراں میں مکمل غواصی میں کامیاب رہے، لیکن ذہن میں زور ڈالنے کے بعد جو امور ہماری فہم میں آئے اور جو تاثرات ہم پر مرتب ہوئے اس کے مطابق انور امام کا مذکورہ افسانہ اپنے آغاز میں ایک علامتی افسانہ نظر آتا ہے کیونکہ اس کا آغاز جس انداز سے ہوتا ہے وہ قاری کو عجیب الجھنوں سے دوچار کرتا ہے ..... حالانکہ اس میں ابہام نہیں ہے لیکن جس طرح اس میں ایک علم کو وجود بخشا اور پھر تیز ہواؤں کے جھونکوں سے اس کا پھڑ پھڑانا عمل پذیر ہوا اور پھر اس علم سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ یہ کسی بھی طور پر روایتی افسانے کا حصہ نہیں نظر آتا ہے بلکہ کلی طور پر یہ علامات کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

”علم بلند ہوا اور رفتہ رفتہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا جیسے آسمان کو چھونے کا متمنی ہو۔ تیز ہواؤں کا جھکڑ چل رہا تھا، علم کبوتر کے مانند پھڑ پھڑانے لگا، علم سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں اور زمین پر پھیلنے لگیں۔ زمین سرخ ہو اٹھی اور پھر علم کے سامنے ایک دوسرا علم بلند ہوا اور دونوں آپس میں مل گئے۔ آگ کے شعلے علم سے بجلی کی مانند کڑک کر نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ ہر سو دھواں پھیل رہا تھا..... پھیلتا ہی جا رہا تھا...... دھویں کا دریا اور اس دریا میں انسانوں کا وجود ڈوب رہا تھا، مدغم ہو رہا تھا۔ چیخیں ابھر رہی تھیں، دلدوز، کربناک، ایسی چیخیں کہ انسان کی روح کانپ اُٹھے، تڑپ اٹھے۔“

(ایوان ادب، ماہ اگست ۲۰۱۶ء، صفحہ۔ ۵۴)

متذکرہ بالا عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے افسانے کی تمہید کو پرزور بنانے کی بے جا مساعی کی ہے۔ کیونکہ آپ نے محض علامت کی دنیا آباد کر کے اس میں کائناتی حقائق کو سمونے کی جو کوشش کی ہے وہ بلاشبہ قاری پر ایک

بے جابارِگراں ہے۔ ذہن نشین رہے کہ کوئی بھی تخلیق ادب ہو یا ادیب محض اپنی تشفی و تسکین کے لیے وضع نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس کے ذہن میں قاری کا ذوق مطالعہ اور قوت فہم بھی شامل ہوتی ہے۔ ہر قاری اس کا اہل نہیں ہوتا کہ وہ ایسی علامات کی معنوی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکے۔ چنانچہ جس طرح ہر تخلیق کار کو قاری کی تفہیمی استطاعت کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوتا ہے ویسے ہی انور امام کو بھی رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن کیا کیجئے کہ ''شبِ خون'' نے جو شعلے روشن کیے اسے بے پناہ آندھیوں نے زور آور کیا۔ آج گو کہ وہ آتشِ شخصیت سوز قریب قریب گل ہو چکی ہے لیکن یہ بھی ایک بلا تردید حقیقت ہے کہ امروز فردا میں اس خاکستر سے کچھ کچھ شرارے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں.... اس عمل کا ایک عنصر انور امام کے افسانہ ''کربلا'' کا یہ ابتدائی حصہ ہے۔ جو عام قاری پر کسی ہتھوڑے سے کم ضرب کاری نہیں کرتا ہے۔

مذکورہ افسانہ کو افسانہ نگار نے ''واقعہ کربلا'' کی مماثلت سے نوازنے کی مساعی کی ہے۔ شاید اسی باعث اس کا عنوان کربلا رکھا تھا۔ لیکن واقعات کو جس طرح ترتیب دیا ہے وہ کربلا سے مماثلت نہیں رکھتے۔ حالانکہ کردار کا نام بھی اہل کربلا کے نام کے طور پر استعمال کیا ہے، لیکن پلاٹ کی ترتیب کو اس واقعہ سے ہم آہنگ کرنے میں آپ ناکام رہے ہیں۔ محض دنگا فساد اور قتال کو واقعہ کربلا کے مماثل ثابت کرنے کی کوشش کو تجاہل عارفانہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ کربلا کا واقعہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا، اس کے اسباب الگ الگ تھے بلکہ اس کا وقوع پذیر ہونا نہ صرف ایک غیر متوقع عمل تھا بلکہ ناگہانی ستم تھا جس کے محرکات میں ایسے نکتے کارفرما تھے جو کسی طرح بھی افسانہ کربلا سے مماثلت نہیں رکھتے، اسے ایک تمثیلی افسانہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ تمثیل کے جو التزامات ہیں ان کا فقدان نظر آتا ہے۔ اس ناچیز نے جو تمہید اوپر درج کی ہے اس کے ذیل میں جو انور امام نے رقم فرمایا ہے، ملاحظہ ہو:

''حسینؓ کا کٹا ہوا سر یزیدی فوج کا سردار اپنے نیزے پہ لے کر فضا میں اچھال رہا تھا۔ افواج کے منہ سے مسرت بھری چیخیں نکل رہی تھیں۔ اور پھر اس کی نگاہوں نے دیکھا حسینؓ کے سر کے ساتھ اور بھی کئی کٹے ہوئے سر نیزوں پہ تھے۔ ان سروں میں علی رضا' عباس اور شبیر کے سر بھی تھے اور ان کا وجود بھی اس دھویں کے دربار میں ڈوب رہا تھا' مدغم ہو رہا تھا۔''

(ایوان ادب۔ اگست، صفحہ ۵۴)

بلاشبہہ آپ نے یہاں میدان کربلا کی منظر کشی کی ہے اور کردار نگاری بھی ویسی ہی کی ہے۔ لیکن پھر بھی پلاٹ میں یکسانیت کا فقدان ہے۔ گو یہ جو منظر ہے وہ محض ایک خواب کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ اب یہ کہنا شاید غیر ضروری نہیں ہوگا کہ خواب میں ایک انسان پیش آنے والے تمام واقعات کا من و عن مشاہدہ نہیں کر سکتا ہے کیونکہ خواب خواب ہی ہوتا ہے، حقیقت نہیں۔ اور اکثر یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ لوگ خواب کو حقیقت تسلیم کرنے کی فاش غلطی کر لیتے ہیں۔ یہاں معاملہ دیگرے است۔ مذکورہ افسانے کا جو اختلافی پہلو ہے وہ آگے آتا ہے۔ وہ یہ کہ علی رضا ایک ایماندار صنعت کار ہے، اس کی فیکٹری میں تنخواہ میں اضافے کے لیے مزدوروں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ علی رضا اس ہڑتال سے پریشان ہے کیونکہ اس کے باعث اسے عظیم خسارے سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اتنے میں اس صنعت کا مزدور یونین لیڈر اس کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ آپ میری جیب گرم کریں تو میں چٹکیوں میں یہ ہڑتال ختم کرادوں گا۔ اس مہربانی کے عوض اس نے علی رضا سے پچیس لاکھ کا مطالبہ کیا، جس پر برہم ہو کر علی رضا نے جواب دیا کہ اتنی بڑی رقم تمھارے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ ان غریبوں کو ہی کیوں نہ دے دی جائے جن سے ان کے معصوم بچے کا بھلا ہوگا۔ اس کے بعد وہ دلال علی رضا کو انتباہ کرتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گیا کہ اس کا انجام بہت برا ہوگا۔

اب قاری خود فیصلہ کریں کہ واقعہ کربلا سے اس افسانے کے پلاٹ کے اس حصے میں کوئی مماثلث ہے۔ کہاں مالی مفاد کا تحفظ اور کہیں مالی ہوسکاری اور کہیں واقعہ کربلا کے اسباب۔ مذکورہ دونوں معاملات کو یکساں تصور کرنا اس نااہل کے بس کا روگ نہیں۔ پھر یہاں ایک سوال مزید کھڑا ہوتا ہے کہ اگر علی رضا کو مزدوروں کے بھوکے ننگے بچوں کی اتنی فکر واقعی ہے جیسا کہ اس مزدور لال چند مندھان سے اظہار کیا تو پھر اس ہڑتال کی نوبت ہی کیوں آتی۔ کیا ہڑتال کے وقت علی رضا کی انسانی ہمدردی کہیں گم ہو گئی تھی جو لال چند مندھان کے مطالبے کے بعد وہ گم شدہ چیز حاصل ہو گئی۔ یہاں علی رضا کی ریاکاری اور مصلحت آمیزی اجاگر ہوتی ہے۔ جو اس کردار کو زبردست طریقے سے مجروح کرتی ہے۔ ہم یہاں اس امر کی توضیح بھی اشد ضروری سمجھتے ہیں کہ گو کہ افسانہ ایک مختصر صنفِ ادب ہے اور اختصار میں اس کا حسن اور اس کی روح ہے پھر بھی اس حقیقت کی تکذیب ناممکن ہے کہ اس میں ایک کردار کے اعمال و افعال اور مزاج متغیر ہو سکتے ہیں، کیونکہ حالات و واقعات کے اثرات کردار ہی پر مرتب ہوتے ہیں، لیکن اس افسانہ میں جو علی رضا کا کردار ہے وہ غیر متغیر ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نیک طینت' شریف اور مثبت کردار ہے۔ لیکن اپنے مفاد کا تحفظ بھی اس کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ وہ اپنے مالی مفاد کے لیے خود غرض ہو جاتا ہے اور ہڑتال کی نوبت آجاتی ہے۔ یہ تمام امور حقائق سے قریب ترین ہیں نیز عین فطرت کے مطابق ہیں۔ لیکن انور امام نے جو پلاٹ مرتب کیا ہے وہ واقعۂ کربلا کے ٹھیک متضاد ہے۔ کربلا کا واقعہ ایمان و یقین' قربانی اور ایثار اور تحفظ اسلام پر مبنی تھا۔ جب کہ مذکورہ واقعہ خود غرضی' مفاد پرستی' مصلحت اندیشی پر مشتمل ہے۔ جو واقعی شریعت اسلامی کے منافی ہے۔

مذکورہ افسانے کا جو کلائمکس ہے وہ بھی کسی طور واقعہ کربلا سے مماثلت نہیں رکھتا۔ علی رضا کی اہلیہ زینب اپنے مرض کے علاج کی غرض سے ڈاکٹر پٹیل کی کلنک جاتی ہے، راستے میں بالکل سناٹا ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی شخص نظر آتا ہے۔ لیکن زینب شہر کے حالات سے بے خبر ہے۔ گو کہ شہر میں فرقہ وارانہ منافرت کا بازار

گرم ہے بلکہ قتل و غارت گری کا عمل جاری ہے۔ ڈاکٹر بہت تاخیر سے اپنی کلنک میں تشریف لاتے ہیں اور زینب کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں کہ ایسے حالات میں یہ کیوں یہاں آ پہنچیں، جب کہ کربلا کا معاملہ دیگر تھا۔ وہاں کذب گوئی کے بل پر تمام ۲۷؍لوگوں کو کربلا میں مدعو کیا گیا تھا۔ یہاں ایسے قتال کے کوئی آثار نمایاں نہیں تھے۔ ایک اطمینان کا عالم تھا کہ گفت وشنید کے بعد واپس اپنے مقام پر لوٹ جایا جایے گا۔ کربلا میں نہ ذاتی دشمنی تھی اور نہ نسلی‘ فقط منصبی عناد تھا۔ کربلا میں قتل و غارت گری کے شکار لوگوں کا منشاء بالکل پاک وصاف تھا۔ لیکن یزیدی فوج کے حوصلے اس قدر بلند تھے کہ اس نے جنگ کے تمام اصول وقواعد کو بالائے طاق رکھ دیا۔ درحقیقت یہ جنگ جنگ نہیں بلکہ ایک منظّم سازش تھی، اور ۲۷؍افراد پر مشتمل قافلہ کذب گوئی‘ وعدہ خلافی اور سازش کا شکار ہوا۔ ان تمام حقائق کے باوجود یہ جو ۲۷؍افراد پر مشتمل اسلامی قافلہ تھا وہ محض دین متین کے تحفظ کے لیے خود کو قربان ہو گیا۔ اپنی موت کو سامنے دیکھ کر بقا کی یہ جنگ محض فرقہ واریت اور ذاتی دشمنی کا شاخسانہ تھی۔ ذہن نشین رہے کہ مزدور لیڈر مندھان نے علی رضا کو برے انجام کا انتباہ دیا تھا۔

مذکورہ افسانے کا اختتام بھی حقیقت سے ہم آہنگ نظر نہیں آتا۔ اس افسانے کا کلیدی نسوانی کردار زینب جب ڈاکٹر کی کلینک سے واپس لوٹتی ہے تو اس کا گھر نذر آتش ہو چکا تھا اور تمام اہل خانہ شہید کر دئے گئے تھے۔ اس قتل کو افسانہ نگار نے واقعۂ کربلا سے مماثل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں کوئی مماثلت ہی نہیں ہے۔ دونوں کی نوعیت علیحدہ‘ مقاصد علیحدہ‘ طریقۂ کار علیحدہ اور ان دونوں معرکوں کے مرتب ہونے والے اثرات علیحدہ۔ غرض کہ کہیں سے کسی قسم کی مماثلت و یکسانیت نظر نہیں آتی۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انور امام ایک تجربہ کار کہنہ مشق اور حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں اور آپ کے مطالعے کا دامن انتہائی وسیع ہے۔ آپ کہانی بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور کہانی میں جاذبیت و کشش پیدا کرنے کے فن پر بھی آپ کو قدرت حاصل ہے گو کہ اس افسانہ ’کربلا‘ میں ضمنی کرداروں کی کثرت ہے۔ اگر اس کثرت سے صرف نظر کیا جائے تو یہ کہنا شاید مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ آپ کی کردار نگاری واقعی قابل داد ہے۔ اور ہر کردار کو افسانے کے پلاٹ سے ہم آہنگ و مربوط رکھنے کا فن بھی آپ کو معلوم ہے۔ جس کے باعث تکنیکی طور پر افسانہ کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے اور افسانہ مقبولیت کی منزل سے ہم کنار ہوتا ہے۔ بلاشبہ تکنیکی طور پر افسانہ ’کربلا‘ بڑا معیاری ہے۔ لیکن فکری طور پر یہ کئی سوالات کے حصار میں محصور ہے۔ پلاٹ‘ کردار‘ واقعات‘ مکالمے اور منظر کشی آپ کا خاصہ ہے۔ پھر بھی حقائق کے آئینے میں اس کا عکس مبہم اور دھندلا ہے۔ ہاں مذکورہ افسانے کا بالکل آخری حصہ جسے اختتامی حصہ کہا جا سکتا ہے وہ واقعی انتہائی متحیر کن اور منفرد ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اس کے سامنے کھڑے میوہ رام پٹیل کی نگاہیں اس کے چہرے پر رک سی گئیں۔ اس نے غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر آنسوؤں بھرا ایک اور چہرہ ابھرا‘ اس کی ماں کا۔ اور پھر اس چہرے پر کئی چہرے ابھرے۔ بھابھی، بہن اور نہ جانے کون کون سے آنسو بھرے چہرے۔ وہ چہرے اس سے التجا کرنے لگے، گڑ گڑانے لگے۔

’’اس کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تلوار والا ہاتھ فضا میں لہرایا اور زینب پر رحم آ گیا‘‘۔

(’’ایوان اُردو‘‘ دہلی۔ اگست ۲۰۱۶ء صفحہ۔ ۵۷)

یہاں جو آخری جملہ ہے وہ واقعی معنی خیز ہے۔ جن میں الجھ کر قاری معلوم نہیں کن کن مفاہیم کے بیکراں سمندر میں غواصی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے.....اور یہی فن افسانہ نگاری کی کلیتاً اور اصل فن ہے۔

☆☆☆

(وہ کیا گیے کہ.....کا بقیہ)

اُف یہ انداز مسکرانے کا۔ دل دھڑ کنے لگا زمانے کا
فصیل وقت کے سایو! ذرا ٹھہر جاؤ۔ کسی کی یاد کے لمحات چن رہا ہے کوئی
ستارے موم ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی شعلہ بدن گرم سفر ہے

شعر وادب کے آستاں پر مرحوم اپنی جبین کا نشان (شاعری کو) بطور نشان چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے ؎

میری جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے
اور آستاں پہ میری جبیں کا نشاں رہے

(اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین)

چلتے چلتے مرحوم کی کتاب انداز غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمالیں:

ہر آدمی بس ایک ہی جانب سفر میں ہے
کوئی کشش ضرور تری رہ گزر میں ہے
مضمر ہے اس میں فلسفہ موت وحیات کا
اک پوری داستان شکستہ کھنڈر میں ہے
آواز دینے والے سے کہہ دو پکار کے
فرحتؔ ابھی ازل کا مسافر سفر میں ہے

اور یہ قطعہ

مشکل ہے مگر کام یہ کرنا ہوگا۔ جینے کے لئے آپ کو مرنا ہوگا
پھولوں کے جزیروں کی تمنا ہے مگر۔ کانٹوں کے سمندر سے گزرنا ہوگا

☆☆☆

اوج اکبر پوری
رہتاس (بہار)

وہ کیا گئے کہ لطف غزالاں چلا گیا

۹ ردسمبر ۲۰۱۶ء کا دن میرے لیے بالخصوص اور عالم شعروادب کے لئے بالعموم سیاہ دن ثابت ہوا۔ جب یہ خبر ملی کہ صاحب لوح وقلم، آبروئے شعروسخن، ماہر فن اوراستاذ الشعرا محترم فرحت قادری (گیا) اس دنیا سے چل بسے۔ سن کر بہت افسوس ہوا۔ ان کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات وایام نظر کے سامنے گردش کرنے لگے۔ وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ ان کے اہل خانہ بھی گھر کا ایک فرد گردانتے تھے۔ ان کی موت نے جو بجلی گرائی ہے اس کا اثر زائل ہونے میں زمانہ لگے گا۔ یہ سچ ہے کہ موت سے کسی کو رستگاری نہیں لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہیں جنھیں موت بھی نہیں مار پاتی ہے اور جن کے نام کا سورج موت کے بادل کے پردے سے بھی چمکتا رہتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بولتے رہیں گے۔ اور ان کے ہونے کا احساس ان کی شاعری ہمیشہ ہمیں یاد دلاتی رہے گی۔

مرحوم بڑے ہی مرنجا مرنج مزاج اور باغ و بہار شخصیت کے حامل تھے۔ نہایت نفاست پسند طبیعت پائی تھی۔ بھیڑ میں بھی وہ دور سے پہچان لیے جاتے تھے۔ حد درجہ خلیق، ملنسار اور خندہ رو تھے۔ احباب کے ساتھ ہوتے تو لطیفہ گوئی سے محفل کو لالہ زار بنا دیتے تھے۔ وہ اپنے رنگ و آہنگ کے علاحدہ شاعر تھے۔ کلام پڑھنے کا مخصوص انداز تھا۔ گیا شہر جو زبان وادب کے معاملہ میں دوسرا عظیم آباد ہے ایسے صاحب قلم اور با اثر شعرا سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ مرحوم کو عزت مآب سحاب سخن ابرار احسن گنوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

ادھر ۳-۴ سال سے ان کی علالت کا سلسلہ جاری تھا۔ کبر سنی کے سبب صحت خراب ہوگئی تھی۔ اپنی بیٹی ڈاکٹر پروفیسر تبسم فرحانہ اور سید ارشاد احمد کے ساتھ گیا شہر کے محلہ نیو کریم گنج میں رہائش پذیر تھے۔ بیٹی نے باپ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ (اللہ موصوفہ کو اس کے عوض اجر عظیم سے نوازے، آمین) وفات کے وقت مرحوم کی عمر ۸۸ رسال کی تھی۔

آپ کا پورا نام سید ابوالفرح ذوالنون محمد جاہ المتخلص بہ فرحت قادری ہے۔ والد کا نام سید ابوالظفر محمد قادری ہے۔ شاید اسی نسبت سے انھوں نے اپنے تخلص کے ساتھ قادری جوڑ رکھا تھا۔ اپنی کتاب ''رقص وعکس'' میں (جو حمد ونعت اور دینی وملّی نظموں کا مجموعہ ہے) مرحوم نے اپنے خاندانی حالات وخاندانی شجرہ نیز اپنی سوانح بہت تفصیل سے لکھی ہے۔ جس سے ان کے خاندانی پس منظر کا پتہ چلتا ہے۔

آپ شعروسخن کا ذوق زمانۂ طالب علمی ہی سے تھا۔ تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ مگر غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں ؎

مجھ سے ملنا ہو تو پھر میری غزل میں ملیے
جذبۂ دل کے حسیں تاج محل میں ملیے

آپ کا شعری سرمایہ ایک درجن کتابوں پر مشتمل ہے۔ کچھ کے نام یہ ہیں۔ زمین بند، کائناتِ غم، علم عروض و بلاغت پر مبنی ضروریات شعروادب، شیشے اور پتھر، رقص وعکس، انداز غزل، ایک جام اور وغیرہ۔ عرصۂ دراز سے گیا کی مشہور ادبی انجمن بزم راہی کے ماہانہ طرحی مشاعرہ کے صدر نشین رہے۔ وہ مصرع طرح بھی دیتے اور مبتدی حضرات کے کلام پر اصلاح بھی فرمایا کرتے تھے۔

فرحت صاحب نے جب غزل کا ساز چھیڑا تھا تو اس وقت پورے بہار میں جمیل مظہری، کلیم عاجز، ہوش عظیم آبادی، زار عظیم آبادی اور رمز عظیم آبادی وغیرہ کی شاعری شباب پر تھی۔ اور ہر طرف ان حضرات کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ان شعرا میں علامہ جمیل مظہری بلاشبہ صف اول کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کے مقابلہ میں فرحت قادری نے اردو ادب کی فصیل پر ایسا جھنڈا لہرایا جس سے لوگوں کو احساس ہوا کہ ان کا کلام اور شاعری شعرا کی بھیڑ میں گم ہونے والی نہیں ہے۔ چنانچہ آج بھی ان کے تلانذہ کی تعداد سیکڑوں میں موجود ہے۔ جس سے وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔

ان کی شاعری تخلیقی شاعری ہے۔ انھوں نے کلاسیکی انداز اور مخصوص پیرائے میں زندگی کے ہر رنگ و آہنگ کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ کلام میں متنوع مشاہدات وتجربات کی تصویر کشی کر کے جان ڈال دی ہے۔ ایک جغرافیائی پس منظر کے تحت اس امر کی وضاحت اس شعر سے ہوتی ہے۔

سورج ہے کعبہ چاند مدینہ شریف ہے
جلتے ہیں دو چراغ ہمیشہ زمین پر

مزید یہ شعر:

آبادیٔ گلشن سے ویرانیٔ صحرا تک
ڈھائے ہیں ستم تو نے اے موج صبا کتنے

پھر استعارے اور معنوی طلسمات سے بھرپور یہ اشعار:

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

غزلیات

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی
Kohsar.Bhiknpur-3
Bhagalpur-812001(Bihar)

بات بنتی ہے اگر دل کی غزل
وہ ادب میں جاوداں رہتی غزل
کچھ نہیں اس کا ادب میں ہے مقام
ہے جو ہماری فکر سے خالی غزل
ہیں تو اصنافِ سخن کیا کیا نہیں
سب پہ ہے تنہا مگر حاوی غزل
تول لے گی وقت کی میزان خود
آپ کی یا میری ہے کیسی غزل
روٹی کپڑا اور اک اچھا سا گھر
اس سے بہتر ہے نہیں کوئی غزل
اے مناظر اک حقیقت ہے یہی
سب کو اچھی لگتی ہے اپنی غزل

گوہر شیخ پوری
Saiban,Doolighat
PatnaCity.800008

مرے بچوں کے تازہ شوق بھی کتنے نرالے ہیں
کھلونے اپنے رکھ کے اب چاقو نکالے ہیں
وہ اپنی بیٹیوں کے واسطے رشتے کہاں ڈھونڈیں
کہ جن کے پاس دولت ہے نہ کھیتوں کے قبالے ہیں
مجھے تنہا نہ تم سمجھو خدا کا فضل ہے مجھ پر
مرے کمرے میں اب بھی کچھ کتابیں ہیں رسالے ہیں
کسی صورت جسے بھائی سے میں نے کم نہیں سمجھا
مری جانب اسی نے طنز کے پتھر اچھالے ہیں
وہی گوہر ہماری خامیاں مشہور کرتا ہے
کہ جس کے آج تک کے کارنامے دیکھے بھالے ہیں

نوٹ۔ گوہر شیخ پوروی صاحب کی یہ آخری غزل ہے۔ موصوف ادبی محاذ کے دیرینہ کرم فرماؤں میں سے تھے۔ دلی رنج ہے کہ موصوف گزشتہ ۱۴ اپریل کو انتقال فرما گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ آمین

رؤف خیر
9-11/137/1,MotiMahal.Golkonda
Hyderabad-8.Mob:9885700350

کب اس کو مجھ سے آنکھ ملانے کی تاب ہے
میں جانتا ہوں کتنا وہ عزت مآب ہے
غنچہ دہن عجب ہے وہ منہ کھولتا نہیں
آبِ حیات اپنی جگہ خود سراب ہے
پیدا ہوئی کتاب کرایے کی کوکھ سے
بے اہلیت ہے پھر بھی وہ اہلِ کتاب ہے
ایسا نہیں تو سامنے آنے سے مت جھجک
چہرہ کہاں ہے چہرے پہ خالی نقاب ہے
تسکینِ جسم و جان ہے ایقانِ آگہی
تشکیک کیا ہے ایک مسلسل عذاب ہے
میری شراب اور ہے، پیرِ مغاں ہے اور
میرے لیے نہیں ہے جو تیری شراب ہے
اب تو رؤف خیر کی پہچان ہے یہی
حق گوئی ہے خراب تو یہ بھی خراب ہے

ڈاکٹر اعجاز داؤد نگری
ShahiTolaWard-9,Daudnagar
(Aurangabad)Bihar-82413

اے زندگی اب تجھ سے مجھے ڈر سا لگے ہے
تو پھول بھی مارے ہے تو پتھر سا لگے ہے
ہر شخص مسائل کے ہے انبار میں الجھا
ہر رنج و الم اب تو مقدر سا لگے ہے
مر جانے کی فرصت بھی نہیں اب تو سکوں سے
یہ زندگی اب کانٹوں کا بستر سا لگے ہے
ہے جستجو بیکار یہاں جائے اماں کی
ہر آدمی میری طرح بے گھر سا لگے ہے
اعجاز جھکاتا ہوں جبیں اپنا جہاں بھی
وہ در تو مجھے آپ کے ہی در سا لگے ہے

حفیظ فاروقی کریم نگری
Ashoknagar,Krimnagar,505001
(Telangana state)

خیر و شر کے درمیاں ہے زندگی
الاماں اِک امتحاں ہے زندگی
منصبِ ادراک پر جلوہ کناں!
اس جہاں پر حکمراں ہے زندگی
باعثِ تخلیق آدم ہیں نبیؐ!
اِک حدیثِ دیگراں ہے زندگی
جسم خاکی خاک میں مل جایے گا
چار دن کی میہماں ہے زندگی
جنت و دوزخ ہیں جس کے منتظر!
وہ بہار بے خزاں ہے زندگی
انفس و آفاق میں افضل ہوئی
حاملِ نطق و زباں ہے زندگی
موت کو کہتے ہیں کروٹ ہم حفیظ
اِک قرارِ جاوداں ہے زندگی

پی پی سریواستو رندؔ
R-16,Sector-XI,Noida-201301
Mob-09711422058

نشاطِ درد کے موسم میں گرمی کم ہے
فضا کے برگِ شفق پر بھی تازگی کم ہے
عجیب لوگ ہیں کانٹوں پہ پھول رکھتے ہیں
یہ جانتے ہوئے ان میں مقدری کم ہے
نہ کوئی خواب نہ یادوں کا بیکراں سا ہجوم
اداس رات کے خیمے میں دلکشی کم ہے
میں اپنے آپ میں بکھرا ہوں ایک مدت سے
اگر میں خود کو سمیٹوں تو زندگی کم ہے
کھلی چھتوں میں دوپٹے ہوا میں اڑتے نہیں
تمہارے شہر میں کیا آسمان بھی کم ہے
کہاں سے لاؤ گے اے رندؔ معتبر مضمون
غزل میں جبکہ روایت کی چاشنی کم ہے

اختر شاہ جہاں پوری

Rangeen Chaupal,
Shahiahanpur-242001(U.P)

تو یقیں ہے تو گماں ہوں میں بھی
تیری عظمت کا نشاں ہوں میں بھی
ملتفت جب سے ہوا وہ مجھ پر
اپنی جانب نگراں ہوں میں بھی
یہ مہہ و مہر ہیں تیرے پر تو
سنگ ریزوں سے عیاں ہوں میں بھی
تو نہیں ہے تو مرا زندانی
قید میں تیری کہاں ہوں میں بھی
ڈال جاتے ہیں جہاں سب نیکی
کیا کوئی ایسا کنواں ہوں میں بھی
موجۂ گل ہے وہ مانا اخترؔ
ایک دریا سا رواں ہوں میں بھی

مہدی پرتاپ گڈھی

28-school ward,partap
gadh,230001(U.P)

وہ رکھ کے لفظوں میں کب دل کا نور بولتا ہے
ہر ایک لفظ میں اس کا غرور بولتا ہے
ہوئی کتابوں سے رغبت مِلا سرورِ حیات
وہ رکھ کے لفظوں میں حسنِ شعور بولتا ہے
ہر ایک سمت نمایاں ہیں ان کے شر کے نشان
وہ چُپ ضرور ہے اس کا قصور بولتا ہے
ہے ذہن میں جو مہذب سماج کی تصویر
مرے عمل میں اسی کا سرور بولتا ہے
کبھی تو جاگے گا مہدیؔ ضمیر قاتل کا
چھپائے لاکھ لہو تو ضرور بولتا ہے
وہ کم سخن ہے مگر ذی شعور ہے مہدیؔ
غلط قدم جو اُٹھیں وہ ضرور بولتا ہے

شرافت حسین

Qazipura,P.O.Tanda.Ambedkar
Nager(U.P)Pin-224190

قیامت کا سماں ہوگا
تماشہ پھر یہاں ہوگا
پرائی آگ مت چھونا
یہ سودا اب گراں ہو گا
یہ فرقہ بندیاں چھوڑو
خود اپنا ہی زیاں ہوگا
ہمیں نیند آیے گی کیسے
جو رہزن پاسباں ہو گا
دلوں میں چور ہے جس کے
وہ کیسے شادماں ہو گا
نہیں آتی جسے اردو
وہ کیا شیریں زباں ہوگا

سید آصف دسنوی

C-12,Sector-6.C.D.AColony
Bidanasi-14(Cuttack)

تری یادوں کے آنچل سے ستارے توڑ لائیں گے
ترے ست رنگ خوابوں کو پھر آنکھوں میں سجائیں گے
تجھے ڈھونڈیں گے اکثر ہم امیدوں کے سرابوں میں
دلِ ویراں سجائیں گے، کبھی صحرا بنائیں گے
کبھی وہ بھولنا چاہے جو ماضی کے حوالوں کو
کسک یادوں کی خود بن کر ان آنکھوں میں سمائیں گے
ہمیں یہ وقت کی رفتار اب مہلت کہاں دے گی
سجا کر اپنے خوابوں میں اسے ہم بھول جائیں گے
کبھی تو ختم ہوگا یہ سرابوں کا سفر آصفؔ
زمیں کو اوڑھ لیں گے ہم کہیں نیندیں بچھائیں گے

ڈاکٹر سید مظفر عالم ضیاؔ عظیم آبادی

وارانشاط، دریاپور، پٹنہ۔۴
Mob:9430558286

بلا کی آرزوئیں ہیں سسکتی زندگانی ہے
ضیا اس دور میں اب ہر بشر کی یہ کہانی ہے
ہر اک گھر میں نئی نسلوں کے بربادی کے ساماں ہیں
مگر یہ فرض اپنا ہے انھیں منزل دکھانی ہے
بھروسہ اب کسی کو دوسرے پر ہو نہیں سکتا
جہاں ہر شخص کو اک دوسرے سے بدگمانی ہے
یہ جس تہذیب کو ہم آج سینے سے لگایے ہیں
حقیقت میں یہی ماں باپ کی اپنے نشانی ہے
ہمیں جیسے مٹانے پر کمر بستہ ہے یہ دنیا
یہ جنگِ حق و باطل کی کہانی بھی پرانی ہے
ضیا اس کی پریشانی تصور سے میرے سمجھو
کسی مفلس کے گھر میں ایک بیٹی گرسیانی ہے

فیض رتلامی

48,Samtanagar(Anand colony)
Ratlam-457001(U.P)

اس زمانے کو دکھا سکتے ہیں ہم
آگ پانی میں لگا سکتے ہیں ہم
درج ہے تاریخ کے پنّوں میں سب
کون کیسا تھا بتا سکتے ہیں ہم
ظلم تھا تسلیم کر لوگے اگر
یاد ہے لیکن بھلا سکتے ہیں ہم
کڑوے لفظوں سے تو کچھ ہوگا نہیں
چُپ تو ہیں پھر بھی سُنا سکتے ہیں ہم
ٹھوکروں سے جوش گر آجیئے گا
راہ سے پتھر ہٹا سکتے ہیں ہم
فیضؔ ہم پیچھے چلیں گے کب تلک
کیا قدم آگے بڑھا سکتے ہیں ہم

علیم صبا نویدی

266.TriplicaneHighRoad
Flat-No,16.2ndFloor,Rice
MandiStreet,Chennai.600005

رسم تھیں ٹہنیاں جلانے کی
پھول سی تتلیاں جلانے کی
خوبصورت سزا ملی ہے مجھے
رات بھر اُنگلیاں جلانے کی
کیاضرورت تھی گھر کے آنگن میں
صندلی لکڑیاں جلانے کی
آپ کیوں آیے شہر کی جانب
بات تھی بستیاں جلانے کی
رسم چھوڑی مشائخوں نے کہاں
کاغذی بتّیاں جلانے کی
پھول والوں کو کیا ملے گی سزا
پھول کی ڈالیاں جلانے کی

حیرت فرخ آبادی

KhoslaHouse,GrandFloor
NorthOfficePara.Doranda.Ranchi-02

ہائے ہندوستاں سلگتا ہے
دوستو! آشیاں سلگتا ہے
آج نفرت کی آگ میں یارو
دیکھ لو ہر مکاں سلگتا ہے
جل ہی جاتا تو کتنا اچھا تھا
یہ جو زخمِ نہاں سلگتا ہے
کہہ نہ پایا زبان سے کچھ بھی
یہ دلِ بے زباں سلگتا ہے
مسکراتا ہے چہرۂ حیرت
اندرونی جہاں سلگتا ہے

مومن خاں شوق

AshrafVilla.11-3-723,Mallapalli
Hyderabad-500001

اور کتنے دن یوں ہی تنہا رہیں
اب یہ سوچا ہے کہ اس سے مل ہی لیں
ہاں سُنا ہے وہ بہت مغرور ہے
شرط ٹھہری ہے چلیں باتیں کریں
دور اور نزدیک کی الجھن مٹے
زندگی کرنے کا فن جو سیکھ لیں
اب تو کچھ منظر کھلا ہے صبح کا
کتنی روشن ہو گئی ہیں محفلیں
واہمے جب جب حقیقت بن گئے
اور بڑھتی ہی گئی ہیں لغزشیں
شوقؔ صاحب شاعری میں احتیاط
شہر میں پھیلی ہوئی ہیں سازشیں

عمران راقم

3,GrantStreet.Kolkata-13

مت پوچھ کس مرض میں گرفتار ہو گیا
اک شخص میرے عشق میں بیمار ہو گیا
حسرت ہمارے دل کی رہی دل میں ہی مگر
ارمانِ وصل جان کا آزار ہو گیا
کیابات تھی وہ میری جسے چومتے ہوئے
وہ اضطراب شوق سے بیزار ہو گیا
مہر و وفا و لطف کرم تھی عزیزِ جاں
اس کا طریقِ عشق سروکار ہو گیا
پتھر لگا تھا جس کی نظر کا بدن پہ دیکھ
اس فتنہ ساز سے بھی ہمیں پیار ہو گیا
کشتی رہِ حیات کی ڈوبے کی کس طرح
راقمؔ ہمارا حوصلہ پتوار ہو گیا

افسر عثمانی

H.NO.5-38,T.R.NagarColony
Post,Jagtial,Krimnagar.505327

خرد بالیدہ رکھتے ہیں جنوں فرزانہ رکھتے ہیں
اثاثہ فکروفن کا ہم مگر شاہانہ رکھتے ہیں
متاعِ زندگی جہدِ مسلسل سے عبارت ہے
ہم اپنے دستِ محنت کش میں آب ودانہ رکھتے ہیں
جواہل خیر ہوتے ہیں کسی سے کد نہیں رکھتے!
سبھی سے دوستی کا جوہرِ خاصانہ رکھتے ہیں
بدلتے وقت نے حالات ابتر کردیے ورنہ
ہم اپنے پیچھے گزرا دور اک شاہانہ رکھتے ہیں
جومومن ہیں وہ اپنی خُو نہ بدلیں گے کسی صورت!
وہ اپنے پاس وحدت کا حسیں خُم خانہ رکھتے ہیں
جہاں کے عیش وعشرت سے ہمیں کیا کام اے افسر
طبیعت اپنی سادہ ہے دلِ بیگانہ رکھتے ہیں

نادر اسلوبی

H.No:6-5-6,Hanamkunda
Warangal-506011(T.S)

اٹل پھر ہم سفر پر ہو گئے ہیں
تر و تازہ نہا کر ہو گئے ہیں
نکالو مشورہ کر کے کوئی حل
اگر حالات بد تر ہو گئے ہیں
سبب ہوگا یقیناً اس کا کوئی
اگر دل سب کے پتھر ہو گئے ہیں
ترے حسنِ اضافی سے ہیں مملو
مرے اشعار زیور ہو گئے ہیں
تصور میں کوئی خوشبو بدن کی
مرے لمحے معطر ہو گئے ہیں
اُنھیں بھی شعر کہنا آگیا کیا
میاں نادرؔ سخن ور ہو گئے ہیں

افسانہ

محبت اور رقابت

قیصر عباس
پتا؛ ڈاکخانہ خاص واصو آستانہ
تحصیل اٹھارہ ہزاری ضلع جھنگ
موبائل نمبر؛ ۰۳۰۱۵۹۵۹۷۰۶

دیہات کا قدرتی حسن بے تحاشا میک اپ کی دبیز تہوں کے تلے دب کر سا رہ گیا تھا اور اس پر زیورات کی بھر مار نے تو اور بھی انھیں کسی جیولری کی دکان پر سجے پتلے کی مانند بنا دیا تھا ہاں البتہ ان کا رقص پھر بھی کسی قدر قابل دید تھا مگر لوک فنکاروں کا شور وغل مچانے والا میوزک دیگر افراد اور شہر یار اور اس کے دوست دیا شنکر کے لیے سر دردی کا باعث بن رہا تھا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے میوزک نے ان کے کانوں کی بینڈ بجا کر رکھ دی تھی بہت سے لوگ تو اس شور شرابے میں صوت سے کم اور اشاروں سے زیادہ کام لے رہے تھے اور وہ بھی یہی طریقہء کار اپنائے ہوئے تھے مگر پھر بعد ازاں انھوں نے مزاح کے لیے صرف اشاروں ہی میں باتیں کرنا شروع کر دیں تھی اور تمام لوگوں سے ایسے ملنے لگے تھے جیسے وہ سچ مچ کے گونگے بہرے ہوں ان جان لوگوں خاص کر لڑکیوں کی توجہ حاصل کر کے تو وہ خوب محظوظ ہو رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکی پر نظر پڑتے ہی شہر یار کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی سچ مچ کی آواز کھو سی گئی ہو اور نظر منجمد سی ہو گئی ہو بلکہ سارا وجود اس کا جیسے جم سا گیا ہو وہ تھی بھی بڑی کمال کی۔حسن و جمال کا کھلا ہوا گلاب ایسا گلاب جس پر ابھی اوس کی بوندیں بھی نہ پڑیں تھی میک اپ تو جیسے اسے بس چھو کر چلا گیا تھا زیور میں بھی ایک باریک سا ناک کا سونے کا کوکا دو چھوٹے چھوٹے کانوں میں پہنے ٹاپس اور ہاتھوں میں بمشکل ایک درجن سرخ رنگ کی چوڑیاں تھی جب کہ ماتھے پر دونوں سہلیوں کے عین وسط میں چھوٹی سی بندیا سجی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان سب لوازماتِ حسن میں اس کے حسنِ شباب نے غضب کی جان ڈال رکھی ہو اور وہ ایسے مسرور سے دکھائی دے رہے تھے جیسے اس مہ جبیں نے انھیں پہن کر ان پر کوئی احسان سا کر دیا تھا۔کہیں ماتھے پر سجی بندیا خود پر نازاں کھڑی تھی تو کہیں گلابی رنگ کی ساڑھی اس کے بدن سے لپٹ کر خوشی سے تمتما رہی تھی۔اور ان سب میں بڑھ کر جو چیز تھی وہ تھی اس کی معصومیت ،بھولی سی صورت جو اسے اپنی جانب مبذول کرنے میں سرخرو ہوئی کھڑی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اس کے جادوئی حسن کے حصار سے باہر آتا اس کا دوست دیا شنکر چپکے سے اس کے پہلو میں سے نکلا اور سیدھا وہاں جا پہنچا جہاں وہ کھڑی تھی اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنی ایک عزیز بوڑھی عورت کے بہانے اس پر نوٹ برسانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ میں آہستگی سے اسے یہ بھی کہنے لگا کہ میرا دوست تم پر فدا ہو گیا ہے یقین نہیں آتا تو اس کی جانب خود ہی دیکھ لیجئے کہ کس طرح سے آپ کے سحر میں گرفتار ہوا کھڑا ہے مگر وہ یہ سنتے ہی ایک طرف چل دی اور چلتے ہوئے اس نے بس ایک نظر نظرِ تجسس سے شہر یار کی جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

شہر یار نے اس کا یہ انداز دیکھ کر اپنے دوست کو اس کے ساتھ کچھ بھی ایسی ویسی حرکت کرنے سے آنکھوں کے اشاروں سے قطعی طور پر منع کر دیا اور خود کے پاس آنے سے بھی منع کر دیا۔اس کے منع کرنے پر وہ حالات کا تقاضا سمجھتے ہوئے ایک طرف چل دیا اور اس کے وہاں سے چلتے ہی فوراً ایک لڑکی نے اسے آگاہ کیا جس کے پاس جا کر وہ کھڑی ہوئی تھی کہ وہ جا رہا ہے تو وہ اس کی جانب دیکھنے کی بجائے شہر یار کی طرف دیکھنے لگی جب کہ شہر یار بد قسمتی سے اس وقت اپنے دوست کی جانب ہی دیکھ رہا تھا لیکن پھر جیسے ہی پلٹ کر اس نے اس کی طرف دیکھا تو وہ دوبارہ پرے منہ کر کے کھڑی ہو گئی اور لڑکیوں کے گروہ میں خود کو اس سے چھپانے سا لگی اس کے اس طرح سے چھپنے کے عمل سے اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ بیچاری شریف سی لڑکی مجھ کمینے کے باعث چھپتی اور ڈری ڈری سی سہمی سہمی سی پھر رہی ہے لہذا وہ وہاں سے چل دیا اپنے شریر منتظر یار کی طرف جو بار بار کن انکھیوں سے ان ہی کی جانب دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ جاتے جاتے دل میں یہ تہیہ بھی کرتا گیا کہ اب اس کی جانب دیکھ کر اسے مزید پریشان نہیں کرے گا۔

مگر اس کے وہاں سے چلے جانے کا سن کر اس لڑکی کے دل کا کھنچاؤ کچھ کچھ اس کی سو بڑھنے لگا اور اندر ہی اندر وہ بے چین سی ہونے لگی لیکن اس نے اس کی تلاش میں نظریں دوڑانے کی جسارت کرنا بھی ہرگز ہرگز قبول نہیں کی یہ سوچتے ہوئے کہ اکثر عاشق یہی تکنیک اپناتے ہیں۔اور جب کچھ وقت گزر گیا تو ایک شناسا لڑکی کو ذرا سا مڑ کر پکارتے ہوئے خود ہی اس جگہ دیکھنے لگی جہاں اس کا یار کھڑا تھا پر تب تک وہ وہاں سے جا چکے تھے اس سے اس کے دل میں دفعتاً طرح طرح کے جذبات و خیالات پیدا ہونا شروع ہو گئے اور اس کی بے قراری بڑھانے لگے نظروں کو اس کی ادھر ادھر دوڑانے لگے لیکن وہ اس کی نظروں کی زد

میں نہیں آئے اور جب کافی دیر کے بعد بیرونی گیٹ سے آتے ہوئے اسے دکھائی دیےتو وہ پھر سے رخ موڑ کر کھڑی ہوگئی مگراب کی بار اس نے جلد ہی اپنا رخ واپس ان کی جانب پھیر لیااور اس امید سے دیکھنے لگی کہ وہ اس کی جانب دیکھیں گےشہر یار کے بھی دل میں آیا کہ ایک نظر اسے دیکھ لےلیکن پھر جی کڑا کر کے چل پڑااور اپنے دوست کو بھی اس کی جانب دیکھنے سے منع کرتا گیا جس سے اس کے جذبات کوشدید ٹھیس پہنچی اور اس نے بھی دل میں خود سے یہ سوال کرتے ہوئے کہ مجھے ہو کیا گیا ہے یہ ٹھان لی کہ اب وہ ان کی سمت نہیں دیکھے گی پر وہ ذرا سی دیر بھی اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی اور لگی انھیں دیکھنے مرضِ محبت میں گرفتار ہوکر اور جب مسلسل اسی طرح دیکھتے رہنے سے بھی بات نہیں بنی تو ایک بچے کو اٹھا کر ان کی جانب چل دی صرف اور صرف شہر یار کی سو تکتے ہوئے اور اس کی بھی اس کے پاس سے گزرنے سے یونہی بے خبر بے ارادہ سی نظر اس کی جانب اٹھ ہی پڑی لیکن پھر جلد ہی اس نے نیچے کر لی اور اس کے دوست نے بھی۔

اور جب وہ چلی گئی تو دیا شنکر بولا ''میں نے اس کی نگاہوں میں تمہارے لئے محبت کا جذبہ دیکھا ہے بے قرار سا اچنبھا سا جواباًاس نے اس کی جانب دیکھا تو بولا ''چل یہاں سے وہاں چلتے ہیں دولہا والی سائیڈ پر دیکھتے ہیں اس بیچارے کے ساتھ کیا کیا ہونے جا رہا ہے۔پھر بڑبڑاتے ہوئے پتا نہیں یہ تجھے آج ہو کیا گیا ہے کیا وہ تیری شناسا ہے کیا آپس میں کچھ رنجش ہوگئی ہے تو بھی نا یار میری سمجھ سے باہر ہےاس کے خاموش رہنے پر ''مجھے کچھ تو بتا یونہی تجسس میں نہ ڈال یار''۔ '' کچھ نہیں بس کسی شریف لڑکی کو تنگ کرنا میں بہت بڑی زیادتی و کمینگی سمجھتا ہوں'' ''تمہارے چرن کہاں ہے میرے باپ میں دھو کر پینا چاہتا ہوں'' ''یونہی موزوں کی سمیل آئے گی''اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور پھر دونوں طرف سے ایک قہقہ بلند ہواہا۔ہا۔ہا۔۔ پر اس قہقہے سے اس لڑکی کے ذہن میں یہ وسوسہ چلا گیا کہ یہ شاید اس پر ہنس رہے ہیں اور پھر وہ دل سے ذرا سا پیار دھکیل کر تھوڑی سی انا بھی لے آئی اور اسی انا کے بل بوتے پر وہیں کھڑی رہی اور اس وقت تک کھڑی رہی جب تک کہ اس کی ایک سہیلی نے آکر یہ نہیں کہا کہ چلو وہاں چلتے ہیں دلہے کا جوتا گم ہوگیا ہے

مگر وہاں پہنچ کر بھی اس نے اپنی انا جوں کی توں قائم ہی رکھی اور اس کی جانب دیکھا تک بھی نہیں اگرچہ محبت کے اندرونی جذبات کے تحت اس نے خود کو اس کے عین سامنے لا کھڑا کر دیا تھا علاوہ ازیں خود کو اس کے سامنے لا کھڑا کرنے میں اس کے دل میں بار بار یہ خدشہ بھی سر اٹھا تا رہا تھا کہ کہیں وہ اس کے آتے ہی چلا نہ جائے مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا کیونکہ ایک تو اس کے اوپر اور اطراف میں مرد وزن کی بھیڑ اتنی تھی کہ اس سے نکل پانا بہت مشکل تھا اور دوسرا یہ کہ اب وہ ذرا سا مطمئن ہو گیا تھا کہ لڑکی اب اس سے بے خوف ہے۔اور پھر اس کے بے خوف ہونے کا ٹیسٹ لینے کے لیے اس نے ایک دو بار یونہی دیکھا بھی سہی لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے دیکھنے ہی لگا اسے پھر سے محبت بھری نگاہ سے پہلے سے بھی زیادہ اس کے حسن پر اس کی سادگی پر فریفتہ ہوتے ہوئے اور اس کی یہ فریفتگی اس کا دوست بھی دیکھ رہا تھا مگر جب اس کی ایک سہیلی نے بھی اس کی یہ نظریں دیکھیں تو اس نے فوراً اس کے کان میں ڈال دی جس سے اس کی ساری کی ساری انا محبت کے بہاؤ میں فنا پذیر ہوکر بہتی چلی گئی اور پھر جلد ہی یہ محبت زوروں سے اسے اس کی طرف دیکھنے پر اکسانے لگی لیکن اس نے یہاں بھی خود پر قابو پاتے ہوئے کسی قدر ہوش ہی سے کام لیا اس نے پہلے خفگی کی نظر سے پیچھے کھڑی اپنی سہیلی کو دیکھا اور پھر نیچے جھکتے ہوئے مگر نظریں اٹھائے ہوئے اس کی جانب دیکھا تا کہ اس کی سہیلی پا نہیں لے پیار بھری بے باک نگاہوں سے، شرم و حیا کا چہرے سے نقاب ہٹاتے ہوئے کسی ساقی کی طرح لطف و عنایت والی نظروں سے اور ساتھ ہی میں پیاسی نظروں سے۔

جبکہ دوسری جانب وہ اپنی چوری پکڑے جانے اور بے بہا لطف وعنایت کرنے پر ایک دم سے بوکھلا سا گیا لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی یہ ہڑبڑاہٹ زائل ہوتے ہوتے پیار میں بدلتی چلی گئی اور پھر وہ ہوا جس کا ہونا اسے غیر یقینی سا لگ رہا تھا اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسہ لگا اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا ایک دل جلا پریمی جو دل ہی دل میں اس لڑکی سے پیار کرتا تھا مگر اظہار نہیں کر پاتا تھا یہ کہتا ہوا اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس پر پل پڑا ''یہ مسلے اب ہماری۔۔۔

☆☆☆

ڈاکٹر محبوب فرید
Editor,Shadab
11-3-861,1stFloor.AnjumanGround
NewMalleepally.Hyderabad-1

نشانی

بزنس کمیونٹی میں بچوں کی شادی کم عمر میں کردی جاتی ہے۔عام لوگوں کی طرح انھیں اخبار میں اشتہار دینے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ میرتج بیورو کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔بازار میں ان کا کاروبار ہی ان کی شناخت ہوتی ہے۔عام طور پر وہ ایک دوسرے پر اعتبار کرتے ہیں۔ہزاروں کا نہیں بلکہ لاکھوں کا کاروبار ''زبان'' پر ہوجاتا ہے اور اگر کوئی مشکل میں پھنس جائے تو سب مل کر مدد کرتے ہیں اور گرنے والے کو سنبھال لیتے ہیں۔

شہر میں ابراہیم سیٹھ کے کئی قسم کے کاروبار تھے لیکن ان کی شناخت ڈیری فارم سے تھی،لاکھوں کا کاروبار تھا۔ڈیری فارم میں سو سے زیادہ آدمی کام کرتے تھے،جو دودھ بچ جاتا تھا اس سے دہی اور دہی سے دیگر کئی چیزیں بنائی جاتی تھیں۔اب ان کے پراڈکٹ شہر کے علاوہ نواحی علاقوں میں بھی سربراہ کیے جارہے تھے۔یوں تو ابراہیم سیٹھ گاؤں سے ایک بھینس ہی لے کر شہر آئے تھے۔ابتدا میں سائیکل پر جاکر گھروں اور ہوٹلوں میں دودھ ڈالتے تھے۔ان کی دن رات کی محنت سے ایک سے دو بھینسیں ہوئیں' دو سے چار اور اب چار سو سے زیادہ بھینسیں تھیں۔لیکن ان میں تکبر نام کو نہیں.........آج بھی ڈیری فارم میں وہ بہ نفس نفیس کام کرتے ہیں۔یہی ان کی کامیابی کا راز ہے کہ دولت ان کے گھر کا راستہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر آرہی تھی۔

ابراہیم سیٹھ کی بیوی حلیمہ بھی بڑی نیک،سمجھدار اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔صدقہ خیرات کے لئے تو ان کے دونوں ہاتھ دن رات کھلے رہتے تھے۔مگر وہ اولاد کی خوشی سے محروم تھیں۔کئی بار ان کا گود ہرا ہوتے ہوتے رہ گیا۔اللہ کی مرضی اللہ ہی جانے۔ابراہیم سیٹھ اپنی اہلیہ کے ساتھ حج کے لئے گئے۔وہاں خوب دعائیں کیں،اللہ نے ان کی دعائیں قبول کرلیں۔لڑکا ہوا تو گھر میں خوشیوں کے شادیانے بجنے لگے۔بیٹا تو ماں کی جان تھا،کامران کی غوغا نے میاں بیوی کو اللہ کا اور بھی شکر گزار بنا دیا۔رمضان میں ان کے گھر غریبوں کو سحری اور افطار کا انتظام کیا جاتا تھا۔زکوٰۃ وصدقات کی تقسیم دن رات چھپے کھلے جاری رہتی تھی۔شہر کے نامور مذہبی اور سیاسی قائدین کے لیے علاحدہ افطار پارٹی کا بندوبست کیا جاتا تھا۔اس طرح شہر میں ابراہیم سیٹھ کی ایک نیک اور سخی انسان کی حیثیت سے شناخت بن چکی تھی۔

ایک بیٹا ہوتے ہی پھر ایک دن حلیمہ کے گھر ایک اور ننھی پری آگئی۔جو باپ کے دل کا چین اور سکون بن گئی۔تھوڑی بڑی ہوئی تو اسکول سے سیدھا باپ کے آفس پہنچ جاتی تھی۔اللہ تعالیٰ دولت کے ساتھ ساتھ اولاد کا سکھ چین بھی عطا فرمارہا تھا۔مگر اللہ کی سنت آزمائش ہے نہ......

کامران دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہوگیا۔اسکول کالج کی پڑھائی مکمل کرلی تو دوستوں نے اسے لندن سے ایم بی اے کرنے کا مشورہ دیا تاکہ باپ کے کاروبار کو چار چاند لگاسکے۔پڑھائی مکمل کر کے کامران باپ کے کاروبار کو مزید فروغ دینے میں جُٹ گیا۔صبح سے شام تک آفس میں کام کرتا رہتا۔اس کی وجہ سے ابراہیم سیٹھ کے ڈیری فارم کے علاوہ دیگر کاروبار بھی وسیع ہوتے گئے۔ان کے پراڈکٹس کی مانگ پورے ملک میں بڑھنے لگی۔جب دولت آتی ہے تو چھپر پھاڑ کر آتی ہے۔جہاں گڑھا ہوتا ہے وہیں پانی جمع ہوتا ہے۔مگر آدمی تو کمزور پیدا ہوا ہے۔ایک خواہش پوری ہوتے ہی اس کی جگہ دوسری آجاتی ہے۔یہ سلسلہ تو کہیں رُکتا ہی نہیں۔

ایک دن کامران آفس میں کام کرنے کے دوران چکرا کر گر پڑا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ کام کی زیادتی کی وجہ سے بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا اس لئے چکر آگئے ہیں۔ڈاکٹر نے ابراہیم سیٹھ کو تنہائی میں کامران کے بہت سارے طبی معائنے کروانے کا مشورہ بھی دیا۔جس میں بلڈ ٹسٹ کے علاوہ برین اسکاننگ بھی شامل تھا۔دوسرے دن کامران پوری طرح نارمل ہوگیا۔سب لوگ اس حادثہ کو معمولی واقعہ سمجھ کر بھول گئے۔ڈاکٹر نے جو معائنہ کروانے کے لئے کہا تھا اس کو یکسر نظر انداز کردیا۔چند دنوں کے بعد پھر ایسا ہی واقعہ پیش آیا تو سب کے ہوش اُڑ گئے۔ڈاکٹر کو طلب کر کے سارے طبی معائنے کروائے گئے۔

ابراہیم سیٹھ کے حاشیہ برداروں نے مشورہ دیا کہ اس بات کو صیغۂ راز میں رکھ کر کامران کی جلد سے جلد شادی کردینی چاہیے۔لڑکے اور لڑکیوں کی شادی میں تاخیر ہو تو بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں۔کسی نے کہا جن،بھوت پریت کے اثرات سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔اس پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔جتنے منہ اتنی باتیں.........

ابراہیم سیٹھ اور حلیمہ نے طے کیا کہ کامران کی جلد سے جلد شادی کردیں گے۔چنانچہ لڑکی کی تلاش شروع ہوئی۔سیٹھ سرفراز حسین جو شہر کے نامور کپڑوں کے بیوپاری تھے نے اپنی بیٹی دینے کے لئے رضامندی ظاہر کردی جو ڈینٹل سرجن تھی۔نہ کسی نے اسم نویسی پوچھی اور نہ کسی نے نام نویسی.....شہر میں

(بقیہ صفحہ 52 پر)

اقبال سلیم
No.97,Aiwan-e-Tahera,
4th Main,8th Cross
J.H.B.C.S Layout.J.P.Nagar Post
Bangalore-560078
Mob:9845006115

افسانہ

دل جلاؤ کہ روشنی کم ہے

اب میری بیوی سرلا گل دان میں گلاب کی جگہ کنول سجانے لگی ہے جو اس کی قوم پرستی کی دلیل ہے۔وہ کنول ہی تو ہے جس پر دولت کی دیوی لکشمی کھڑی روپے برساتی ہے اور کنول ہماری طاقت کا نشان بھی ہے۔ہٹلر کی نازی پاٹی کے نشان سواستک (SWASTIK) کی طرح۔ اگر قوم پرست ہٹلر اپنی ناکردہ گناہوں کی بنا پر ہر اتحادیوں کے ناپاک گٹھ جوڑ کے بھینٹ نہ چڑھ گیا ہوتا تو آج جرمن قوم ناقابل تسخیر ہو کر پورے یورپ پر حکومت کر رہی ہوتی۔اگر یہی ہٹلر ہندوستان میں پیدا ہوا ہوتا تو اب تک پارلیمنٹ سے تاج محل تک زعفرانی رنگ پھیلا دیا ہوتا۔

مگر! میں مسکرا کر کہا۔ ”غالب خستہ جاں کے بغیر کون سے کام بند ہیں“۔
ٹھیک ہے!”اس نے فراخ دلی سے میرا طنز نظر انداز کر دیا“ مگر کیا یہ خوشی کی بات نہیں کہ اب ہماری قوم میں بیداری کی لہر چل نکلی ہے۔کیا گجرات کے فسادات اس کا ثبوت نہیں ہیں؟

یہ ہیں سنجے گپتا کی باتیں....میں اندر ہی اندر پیچ و تاپ کھا کر رہ گیا،ہم دونوں ایک ہی کمپنی میں ملازم ہیں،خیالات میں ہم آہنگی کے فقدان کے باوجود ہم اچھے دوست تھے۔چند ہفتے قبل گودھرا میں چلتی ٹرین سے ایک چنگاری اُٹھی اور پورے گجرات میں آگ بھڑکا گئی تھی۔قانون کی آنکھوں تلے شرپسند لوٹ مار قتل غارت گری کا بازار گرم کئے ہوئے تھے۔کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جس کسی بے گناہ کو زندہ جلا دینے کی خبر نہ آتی ہو۔

ایک دن اسی طرح ان سنگین حالات پر رائے زنی کرتے ہوئے میں نے کہا”ہم کسی اخبار میں کسی بہو بیٹی کو تیل چھڑک کر آگ لگانے کی خبر پڑھتے ہیں اور بلا امتیاز ذات و مذہب اس درندگی اور بربریت کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ آج گجرات ایسی ہی بے گناہ اور مظلوم بہو بیٹیوں کی سسرال اور درندوں کی بستی بن کر رہ گیا ہے۔ جہاں ایک بے گناہ معصوم حاملہ عورت کی پہلے تو عزت لوٹی جاتی ہے پھر اس کے پیٹ سے بچے کو نکال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔آخر ان واقعات کے ذمہ داروں کا مذہب کیا ہے !جب کہ دنیا کا کوئی مذہب اس بربریت اور درندگی کی اجازت نہیں دیتا۔یہ ایسے واقعات ہیں جن کو سن کر پہاڑ جیسے دل دہل جاتے ہیں۔مگر خود گجرات کا سب سے بڑا پہاڑ جسے لوگ وزیر اعلی مودی کے نام سے جانتے ہیں اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا ہے۔حالانکہ مودی ایسا پیارا اور مانوس نام ہے جس سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی خوشبو آتی ہے۔ ”مودی“ نام کا دھاگا عوام کا من پسند اور مضبوط دھاگا ہے اور یہی نام ہماری پُرانی ہندی فلموں کے ایک مشہور ہیرو سہراب مودی کا بھی ہے۔جنہوں نے فلم پکار بنائی تھی جس کے ذریعہ ایک مسلمان شہنشاہ جہانگیر کے ایک بے نظیر انصاف کے داستاں کو دنیا سے متعارف کرایا تھا۔انھوں نے اردو کے ایک مسلمان شاعر”غالب“ پر بھی ایک لاجواب فلم بنائی تھی جس کا ہیرو ایک ہندو بھارت بھوشن تھا اور ہیروئن ایک مسلمان اداکارہ ثریا تھی۔خود ان کی بیوی مہتاب ایک مسلمان عورت تھی۔یہی نہیں میرے وطن کرناٹک کے ایک مشہور زمانہ ماہر امراض چشم بھارت رتن ڈاکٹر ایم سی مودی کا بھی یہی نام ہے جن کی ساری عمر خدمت خلق میں کٹی ہے۔اُن کے آگے کوئی ہندو تھا نہ مسلمان،نہ اچھوت نہ برہمن ،اور نہ امیر نہ کوئی غریب۔سب کے لیے ان کے دروازے کھلے ہیں دراصل یہی سیکولرزم ہے،جس کا دوسرا نام انسانیت ہے۔

یہ سن کر وہ حقارت سے ہنسا”نریش! مجھے نہیں معلوم کے سیکولرزم کس جانور کا نام ہے مگر تمھاری باتوں سے اقلیت نوازی کی بُو آتی ہے۔ہماری یہاں کی اقلیتیں غیر ملکی ہیں۔ان کے آباء و اجداد صدیوں تک ہمیں غلام بنایے رکھا،ہم پر حکومت کی ہے،ہماری عبادت گاہوں کو ڈھا کر اپنی عبادت گاہیں تعمیر کی ہیں۔اب ہم آزاد ہو چکے ہیں ،ہم اپنی غلامی کی نشانیاں مٹا کر اپنی زمین پر اپنی تہذیب اور اپنے رسم و رواج کو فروغ دینا چاہتے ہیں،تو یہ شور شرابہ کیوں؟ ہر کوئی اپنے حق کے حصول کی راہ میں آڑے آنے والے کانٹوں صاف کرنے کا مجاز ہے“۔

میں نے ٹوکا”تم اقلیتوں کو غیر ملکی سمجھتے ہو تو یہ تمھاری تنگ نظری اور تاریخ سے لاعلمی کا ثبوت ہے۔اس طرح تو ہم بھی غیر ملکی ہیں۔ہمارے آباء و اجداد”آریہ“ تھے،جو وسط ایشیا سے نکل کر کوہِ ہندوکش کی راہ ہمارے ملک میں داخل ہوئے اور یہیں آباد بھی ہو گئے تھے۔انھوں نے یہاں کی قدیم اور اصل قوم”ڈراوڑ“ کو دکن کی طرف مار بھگایا تھا۔ غالباً ملک میں ان کی پہلی دہشت گردی تھی۔”آریہ“ کی آمد کا ایک ثبوت اردو کے ایک نامور شاعر اقبال کے اس شعر سے ظاہر ہے جو ان کے مشہور ترانہ ”ترانۂ ہندی کی زینت ہے جسے آج ملک کے بچے، بوڑھے، جوان سب بلا

تفریق ومذہب دہرا رہے ہیں۔

اے آب رودگنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو۔ اُترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

''کیا کسی نے اس حقیقت کو جھٹلانے کی یا تردید کرنے کی ہمت کی ہے'
ہم جس زمین کو اپنی زمین کہتے ہیں وہ ہماری ہے۔ نہ ہندو کی ہے نہ مسلمان کی نہ سکھ کی ہے نہ عیسائی کی یہ زمین صرف بھگوان کی ہے۔ جسے اس نے اپنی تمام ترمخلوقات کے لئے بنائی ہے، جس میں انسان حیوان چرند پرند حتیٰ کہ حشرات الارض تک شامل ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی مر کر یہ زمین اپنے ساتھ نہیں لے جاتا، ہر کسی کو صرف دو گز زمین کافی ہوتی ہے۔ تم ان بادشاہوں، شہنشاہوں کو یاد کرو جو اپنی حکومتوں اور زمینوں کے لئے لڑتے تھے۔ آج ان کے نام حرف تاریخ میں بند ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ خود دو گز خاک کی چادر اوڑھے ابدی نیند سوئے ہیں۔''

''یہ سب سادھو سنتوں کی باتیں ہیں''۔ مہتہ نے بات اڑا کر کہا۔ لیکن تم نے دہشت گردوں کی صحیح تعریف نہیں کی۔ دہشت گرد وہ ہے جو کشمیر میں مذہب اور وطن کے نام پر بے گناہوں کا خون کر رہے ہیں جن میں زیادہ تر ان کے ہی بھائی بند ہیں۔ افغانستان میں بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہم بھی گجرات میں اپنے وطن کے حصول کے نام پر فساد کرتے ہیں تو، یہ بات اس بات کا مطالبہ ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ہے، ہم ہندو راشٹر بنائیں گے۔ اپنی زمین اور وطن کے لئے لڑنے والے لوگوں کو مجاہدین آزادی کہا جاتا ہے، دہشت گرد نہیں۔ دہشت گرد تو وہ جنھوں حملہ کیا تھا جس میں ہزاروں بے گناہ امریکی مارے گئے تھے۔ کیا تم ان حملہ آروں کو دہشت گرد نہیں کہو گے... کیا وہ دہشت گرد نہیں تھے؟

''ضرور تھے''.....! میں نے خندہ پیشانی سے اعتراف کیا۔ ''دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ بلکہ ان کے خود بھائی بندوں تک نے ان پر لعنت و ملامت کی بارش کی تھی اور کر رہے ہیں مگر ان مٹھی بھر دہشت گردوں کے ظلم کی سزا ان کی ساری قوم کو دینا کہاں کا انصاف ہے۔'' کوئی فرد چوری کرے تو اس سے اس کا خاندان بدنام تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن سزاوار نہیں ہو سکتا۔ انھیں ایک دن خیالات بدلنے ہوں گے۔
یہ سن کر وہ اس طرح ہنسا جیسے کسی بچے کی بات پر ہنسا ہو، پھر ہم چائے کی طرف متوجہ ہو گئے جو اس کی بیوی لے کر آئی تھی۔ اس بات کو کئی دن گزر گئے پھر ایک دن فساد کی آگ نے ہمارے شہر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

اس دن اتوار تھا، مہتہ کی بیوی اور بچے کہیں گئے ہوئے تھے وہ گھر کو تالا لگا کر میرے یہاں چلا آیا تھا۔ اس وقت ہم بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اُٹھایا اُدھر مہتہ کے خسر گپتا جی بول رہے تھے۔ ''کچھ دیر قبل ہم نے سنجے مہتہ کے گھر فون کیا تھا مگر وہ نہیں ملا، کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ اس وقت کہاں ملے گا؟ میں نے جواب دیا ''مہتہ یہاں ہے۔ میں ابھی اسے فون دیتا ہوں انتظار کیجئے۔''
مہتہ مجھ سے فون لے کر کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے سے شدید پریشانی عیاں تھی۔ وہ فون رکھ کر میری طرف مُڑا ''نریش! میرے خسر کا فون تھا بہت دیر ہوئی کہ امبیڈکر روڈ پر ایک سرکاری بس میں بم پھٹا تھا جس میں سرلا اور میرا بچہ بابو سفر کر رہے تھے کئی لوگ زخمی ہوئے ہیں اور یہ دونوں بھی زخمی حالت میں مہاتما گاندھی اسپتال لے جائے گئے ہیں مگر خطرے سے باہر نہیں، میں وہیں جا رہا ہوں تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

ہم دونوں اسکوٹر پر سوار ہو کر چلے، اسپتال کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ ہم پہنچے تو احاطے میں عوام اور زخمیوں کے رشتہ داروں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس میں افراتفری پھیل گئی اور راستہ بند ہو گیا۔ دراصل ہجوم ان دو مسلم نوجوانوں کی طرف بڑھ رہا تھا جو اسپتال سے باہر آ کر اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم ان پر ٹوٹ پڑا اور انھیں لاتوں اور گھونسوں کی نوکوں پر رکھ لیا۔ دونوں نوجوان ہاتھ جوڑے ان کی منت سماجت کر رہے تھے ''ہمیں چھوڑ دو.... مت مارو ہم بے گناہ ہیں''۔

مگر ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو رہی تھیں۔ دفعتاً فضا میں دو دردناک چیخیں گونجیں۔ کسی نے ان کے چاقو گھونپ دیا تھا۔ اچانک پشت سے مہتہ کی آواز گونجی ''انھیں مارو .... انھیں زندہ مت چھوڑو، یہ سانپ ہیں، ہمارے دشمن ہیں''۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا ''یہ قاتل ہیں ...قاتلوں کے بھائی بندے ہیں۔ ان کی بوٹی بوٹی الگ کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو''۔

میں نے اس کا بازو تھام کر اسے خاموش کرنے کی کوشش کی مگر بے سود.
وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ ''ٹھہرو....'' دفعتاً کہیں دور سے کسی کی آواز گونجی ''ٹھہرو ٹھہر و جاؤ.....
میں نے مڑ کر دیکھا، یہ مہتہ کے خُسر گپتا جی تھے۔
''ٹھیرو.... بھگوان کے لئے انہیں مت مارو....'' وہ زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے ہجوم کو چیر کر ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔
''میں تمھیں بھگوان کا واسطہ دیتا ہوں .....انھیں چھوڑ دو...وہ بے گناہ ہیں.....'' وہ ہانپ رہے تھے، غالباً دوڑتے ہوئے یہاں تک آئے تھے۔

''آپ انھیں بچانے آئے ہیں....! مہتہ ان کی طرف مڑا ''ان سانپوں کو کیا آپ اپنی بیٹی اور نواسے کو بھول گئے، کیا ان کے ڈسنے والوں کے بھائی بندے نہیں ہیں؟''

گپتا جی نے اسے پرے دھکیل دیا ''دیوانے نہ بنو، جوش سے نہیں ہوش سے کام لو۔'' انھوں نے گردن موڑ کر ایک لمحے کے لئے نوجوانوں کی طرف دیکھا جو زمین پر دم توڑ چکے تھے اور کانپ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور ایک کرب کے عالم میں مہتہ سے بولے ''یہ نوجوان ۔:انھوں نے ایک آہ بھری ...یہ نوجوان دشمن نہیں تھے، سانپ بھی نہیں تھے، فرشتے تھے''۔ انھوں نے جیب سے رومال نکال کر اپنی

آنکھیں صاف کیں اور رُندھے ہوئے گلے سے بولے"انھوں نے تمھاری بیوی اور بچے کو جلتی ہوئی بس سے کھینچ کر نکالا اور اسپتال پہنچایا تھا۔اُن کی زندگی بچانے کو خون تک دیا تھا۔انھوں نے سرلا سے نمبر لے کر تمھیں گھر فون کیا تھا تم نہیں ملے تو مجھے فون کیا اور اس وقت تک وہاں سے نہ ٹلے جب میں وہاں نہیں پہنچ گیا اور ڈاکٹر نے اطمینان نہیں دلایا کہ اب وہ خطرے سے باہر ہیں۔یہ میرے سامنے کی بات ہے،دونوں ابھی ابھی آشیرواد لے کر گئے تھے۔مگر...آہ!"۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رُکے اور آنسو پی کر بولے"تعصب کا پردہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے وہ دوست دشمن کی تمیز کو بھول کر خون کی ہولی کھیلنے لگ جاتا ہے۔نہ جانے کتنے بے گناہ خون میں رنگے جا رہے ہیں۔محض اپنے خیالی انتقام کی پیاس بجھانے کے لئے سہاگ لوٹے جا رہے ہیں۔عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔ماؤں کی آنکھوں تلے ان کے جگر کے ٹکڑے ذبح ہو رہے ہیں۔"انھوں نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور سسک پڑے۔

دفعتاً مہتہ کے ہاتھ سے اس کی عینک چھوٹ کر زمین پر گری اور چور چور ہو گئی۔وہ پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑے کبھی گپتا جی کی طرف کبھی لاشوں کی طرف دیکھتا تھا۔جن کے خون کا ایک حصہ ابھی بھی اس کی بیوی اور بچے کے خون میں مل کر انھیں موت کے منہ سے چھینا تھا۔اب اسی خون کا بقیہ حصہ اسی گاڑی کی ٹنکی سے رسنے والے تیل کی طرح لمحہ بہ لمحہ سڑک پر پھیل کر خاک کا ایک حصہ بنتا جا رہا تھا۔ یہ خون کتنا سستا اور کتنا مہنگا تھا!فضا خاموش تھی ،ہجوم خاموش تھا،مہتہ خاموش تھا۔میں نے نگاہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا،مجھے ایسا لگا جیسے گل دان میں سجی ہوئی کنول مرجھا گئی ہو،جیسے سب کا من پسند مذہبی دھاگا اپنے آپ ٹوٹ گیا ہو۔جیسے ہٹلر ایک بار پھر شکست کھا گیا ہو۔

☆☆☆

(نشانی کا بقیہ)

دونوں کا نام ہی ان کی پہچان تھی۔حد تو یہ کہ دونوں طرف سے کسی نے بھی دریافت کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔رشتہ داروں کے ساتھ دو تین نشستوں میں ساری باتیں طے ہو گئیں۔دن تاریخ اور مقام کا بھی تعین ہو گیا،اور ایک ہفتے کے اندر بڑے دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔آج کے دور میں آدمی کے پاس پیسہ ہو تو کیا نہیں ہو سکتا..........؟

شہر کے بڑے بڑے تاجر،سیاسی و مذہبی قائدین،دوست احباب اور رشتہ داروں سے امپیریل گارڈن بھرا تھا۔ہر سو رنگ و نور تھا اور ہمہ اقسام کے کھانوں کی خوشبو......کامران کو عقد نکاح سے قبل بھی چکر آ رہے تھے مگر اللہ نے لاج رکھ لی۔عقد ہوتے ہی مبارک بادیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔دولہا اور دولہن پر خدا کا خاص نور برس رہا تھا۔دولہن بہت خوش تھی اور دولہا بھی خوش تھا،مگر کچھ تھکا تھکا سا دکھائی دے رہا تھا،کیونکہ کامران کا خون اندر ہی اندر سفید ہو رہا تھا۔اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

سوائے چند لوگوں کے.................!!

اولاد کی خاطر آدمی کیا نہیں کرتا؟......ابراہیم سیٹھ جیسے نیک شخص کے پیر بھی اولاد کے پیار میں ڈگمگا گئے اور حلیمہ جیسی دین دار خاتون بھی اپنے بیٹے کو موت کے قریب دیکھتے ہوئے بھی نوشین جیسی خوبصورت،تعلیم یافتہ اور دولت مند باپ کی بیٹی کا مقدر داؤ پر لگانے آمادہ تھی۔نوشین چند دنوں کے لئے میکے چلی گئی۔ایک ماہ بعد نوشین نے کامران کو خوش خبری سنائی کہ وہ بہت جلد باپ بننے والے ہیں۔کامران تھوڑی دیر کے لئے سکتہ میں آ گیا۔اب نوشین کو کون بتائے کیسے بتائے کہ ملک الموت کے قدم آہستہ آہستہ کامران کی طرف بڑھ رہے ہیں۔اس کی زندگی کے چراغ کی لَو مدھم پڑ رہی ہے۔.........ایک دن کامران آفس جانے کی جلدی میں نک ٹائی باندھ رہے تھے کہ وہ چکرا کر گر پڑے تب نوشین کا ماتھا ٹھنکا۔نوشین نے اس واقعہ کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ کامران کے پورے طبی معائنے کروائیں۔......مگر اب کیا فائدہ.....کامران....بلڈ کینسر میں پوری طرح مبتلا ہو چکا تھا اور زندگی کے دن گن رہا تھا۔

آخر کامران کو کینسر ہاسپٹل میں شریک کروا دیا گیا۔لوگ کہنے لگے بیوی کا قدم اچھا نہیں ہے۔.........کامران کو شادی راس نہیں آئی۔کسی نے کہا باپ کے لئے دولت کماتے کماتے بیٹا موت کے منہ میں چلا گیا۔جتنے منہ اتنی باتیں....خون کے کینسر(لیوکیمیاء) کے مریض کا عرصۂ حیات ہر لمحہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔دو مہینے کی بیماری کے بعد کامران اللہ کو پیارا ہو گیا۔نوشین کامران کی نشانی لے کر عدت کے دن پورے کر رہی تھی۔خدا کی قدرت کا کمال دیکھئے نوشین کو لڑکا ہوا جو ہو بہو کامران ہی کامران تھا۔بڑا کامران دنیا سے گیا تو اللہ نے چھوٹے کامران کو بھیج دیا۔اداس گھر میں خوشیوں کے شادیانے بج گئے۔نوشین بس اسی کو دیکھ کر جی رہی تھی۔

☆☆☆

ضیا جعفر
No.436, 1st Floor.9th Cross
Kumar Swami Layout
Banglore-560078(Karnataka)

افسانہ

ناکام تجربہ

اپنے شیطانی کارخانے کے ایک ائرکنڈیشن کیبن میں شیطان پریشان حال بیٹھا ہوا تھا۔ رہ رہ کے وہ اپنے موبائل کو دیکھتا جارہا تھا جس نے خاموشی کا برت رکھ لیا تھا۔ کل تک وہی موبائل حضرتِ انسان کے حرکات کی پل پل خبر دے رہا تھا۔ اس نے روئے زمین پر اپنے ایجنٹ چھوڑ رکھے تھے جن کا کام حضرتِ انسان کو بہکانے کا تھا۔ ہر پل کی خبر دیتے ہوئے اس سے احکامات بھی لیتے رہتے تھے کہ کس کو کس طرح بہکانا ہے، کس کو اپنے شیطانی شکنجے میں کسنا ہے۔ لیکن آج اچانک موبائل خاموش کیوں ہے؟ اس نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے؟ شیطان نے موبائل کو غور سے چیک کیا۔ بیٹری بھی ٹھیک تھی اور کرنسی بھی فل تھی۔ کہیں نیٹ ورک کا کوئی پرابلم تو نہیں؟ نیٹ ورک کا سگنل بھی ٹھیک لگا۔ اس نے سوچا کیا اس کے ایجنٹ اسے بھول گیے یا ان کے دل سے اس کا ڈر نکل گیا ہے؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر ٹی وی آن کیا۔ ٹی وی پر کوئی نیتا بھاشن دے رہا تھا۔ بھاشن کچھ ایسا تھا کہ شیطان غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ نیتا انسان کو انسان کے خلاف اکسا رہا تھا۔ گویا اس نے شیطان سے ٹکرانا چاہا تھا۔ ''ہوں!'' اس کے منہ سے نکلا۔ بھلا انسان کس طرح سے ٹکر لے سکتا ہے؟ کیا انسان شیطان پر حاوی ہوسکتا ہے۔ اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہ جایے تو یہ بھی ممکن ہے اس نے سوچا۔

اس نے شراب کے کیبن سے ایک تیز قسم کی امپورٹیڈ وہسکی نکالی اور ایک ہی سانس میں بوتل خالی کردی۔ لیکن امپورٹیڈ وہسکی نے بھی اس کی پریشانی کو دور نہیں کیا۔ اس کی واحد پریشانی یہ تھی کہ اس کے ایجنٹ کچھ رپورٹ نہیں بھیج رہے تھے۔ وہ حضرتِ انسان کو بہکانے میں لگے ہیں یا نہیں؟ آخر ان کی غیر حاضری کا کیا سبب ہے؟ شیطان کے ذہن میں ڈھیر سارے سوالات کیڑوں کی طرح کلبلانے لگے۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ خود چل کر ان تمام باتوں کی جانچ پڑتال کرے گا۔ ہمت ہارنا انسان کا کام ہے شیطان کا نہیں۔

یہ سوچتا ہوا وہ اٹھا اور اپنے میک اپ روم میں داخل ہوگیا۔ دوسرے ہی لمحہ وہ ایک خوبصورت نوجوان کے روپ میں تبدیل ہوچکا تھا۔ آئینے میں آخری بار اپنا جائزہ لیتے ہوئے ایک الوداعی نظر ڈال کر باہر نکل پڑا۔ آج اس کے ارادے بڑے ہنگامہ خیز لگ رہے تھے۔ بلو ہیون کلب میں نیے سال کی خوشیوں کا ہنگامہ عروج پر تھا۔ ہائی سوسائیٹی کے اونچے لوگ یہاں پرانے سال کو گڈ بائی کہہ کر نیے سال کو ہیلو کہنے کی خاطر جمع ہویے تھے۔ نیے سال کے استقبال کے لیے کلب کسی نئی نویلی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہال میں مدھم سی رنگین روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ماحول بڑا رومان انگیز ہورہا تھا۔ آرکسٹرا کی موسیقی دلوں کے تاروں کو چھیڑ رہی تھی۔ نیے نیے رنگوں اور نیے وضع قطع کے لباس میں ملبوس جوڑے ایک دوسرے سے محوِ اختلاط تھے۔ حسن وزیبائش کے پیکروں سے ہال جگمگا رہا تھا۔ نوجوان جوڑے چکنے فرش پر محوِ رقص تھے۔ ہر کوئی مسرور وشاداں لگ رہا تھا۔ زندگی بھی تھرکتی نظر آرہی تھی۔ حسن گنگنا رہا تھا۔ روح مستی میں جھوم رہی تھی۔ دل مچل رہا تھا اور جوان جسموں کا لمس تن من کو جھلسانے لگا تھا اور ان جسموں کی خوشبو فضا میں رچ بس گئی تھی۔

شیطان نے اپنے شیطانی قدم جیسے ہی ہال میں رکھے چند حسین وجمیل لڑکیوں کی شوخ نگاہیں اس کے چہرے سے ٹکرائیں۔ شیطان بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ خوش ہوگیا کہ انسانوں کو اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہے۔ بالکل فلمی ہیرو لگ رہا تھا۔ کچھ لڑکیاں اپنا مرمریں ہاتھ اس کے کاندھوں پر ٹکائے ''ہیلو ہینڈ سم'' کہہ کر تقریباً چپک سی گئیں۔ اس کے ہونٹ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے اور لڑکیوں کے دلکش چہرے کندن کی طرح چمک رہے تھے۔ شیطان اس خوبصورت حادثے سے بوکھلا گیا۔ اس کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ابھی وہ خود کو سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک بتیاں گل ہوگئیں۔ پھر کیا تھا اس کے رخسار پر بوسوں کی بارش ہونے لگی۔ اس کی سانس رکتی معلوم ہوئی۔ ایک بے بس پنچھی کی طرح خود کو اس نے لڑکیوں کے حوالے کردیا۔

دوسروں کو جہنم رسید کرنے والا آج خود جہنم کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس آگ سے اس کا وجود پگھلنے لگا۔ خود کو درندوں کے درمیان محسوس کرنے لگا۔ آج اس کی کوئی حرکت کارگر ثابت نہیں ہورہی تھی۔ ابھی وہ سوچ کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا کہ معاً سارے ہال میں ہیپی نیوائر کی آوازیں جلترنگ کی طرح گونج اٹھیں۔ آواز کے ساتھ ہال کی روشنی تیز ہوتی گئی اور بوتلوں کے کاگ اڑنے لگے۔ پیگ پر پیگ چڑھائے جارہے تھے۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ میں بھی اضافہ ہونے لگا تھا۔ وہ سہما سہما ہال کے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ دو آفتیں اس کے جسم سے جونک کی طرح

چمٹی ہوئی تھیں ۔ان کو پہلی بار اس نے بھر پور نظر سے دیکھا۔دونوں لڑکیاں شراب کے نشے میں دھت، جسم کپڑوں سے تقریباً بے نیاز اور زبان سے فحش کلمات مزے لے لے کر اگل رہی تھیں ۔دوسرے جوڑوں کا بھی یہی حال تھا۔آرکسٹرا کی شہوت انگیز دھن نے لوگوں کے ذہن سے شرم وحیا کے سارے پردے نوچ ڈالے تھےاور وہ سبھی وحشیانہ رقص میں مشغول تھے۔اس ننگ دھڑ نگ ماحول میں شیطان کا دم گھٹنے لگا۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اتنی پستی میں جا سکتا ہے۔کلب آ کر اسے یہ نیا تجربہ ہوا تھا۔ابھی وہ انسان میں چھپی شیطانیت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اس کی نظر رقص کرتے جوڑوں پر پڑی اور وہ چکرا سا گیا۔اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔پتہ نہیں یہ خواب تھا یا حقیقت ۔اس کے اپنے ایجنٹ جوانسانوں کو بہکانے کی غرض سے آیے تھے وہ ان عریاں جسموں سے لطف اٹھا رہے تھےاور خود انسانی وجود کا شکار ہو چکے تھے۔اسے اپنے ارادوں کی عمارت گرتی ہوئی نظر آئی۔خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر نا کام رہا وہ کسی بوسیدہ دیوار کی طرح زمین پر گرنے لگا۔

''ایڈیٹ کہیں کا ...زیادہ پی گیا ہوگا'' گرتے وقت شیطان کو اپنے ایجنٹوں کی آواز سنائی دی۔

☆☆☆

(احسان کا بقیہ)

کرنا چاہتا ہوں''۔

''ہاں ہاں بیٹا! کہو کیا بات ہے''۔

میں نے ٹھہر ٹھہر کر تفصیل سے انھیں ساری باتیں بتائیں۔میں نے انھیں یقین دلایا کہ بشریٰ باجی کو میں نے چھوا تک نہیں ۔وہ کل تک جس طرح پاک تھیں آج بھی ویسی ہی ہیں۔ ماموں جان پریشان ہو گئے ۔ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے ۔کافی غور کرنے کے بعد انھوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا ''معاملہ بہت پیچیدہ اور گمبھیر ہے۔تم جب اتنا آگے بڑھ گئے ہو تو مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔تمھاری تجویز قابل ستائش ہے، پھر یہ کام میرے علاوہ کوئی کر بھی نہیں سکتا''۔

بڑے ماموں جان ہم سب کے مربی تھے۔ان کی بات اثر رکھتی تھی۔ مجھے امید تھی کہ سب ان کی بات تسلیم کرلیں گے۔وہ فوراً جاوید بھائی کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں انھوں نے جاوید بھائی کی بیوہ والدہ فریدہ بیگم سے باتیں کیں ۔پھر میرے گھر آ کر والد صاحب سے مشورہ کیا۔وہیں خالو جان، چچا جی ،رفیق چچا خاندان کے دیگر مربیوں کو بلوالیا۔ یہی فیصلہ ہوا کہ اختر طلاق دیدے اور بشریٰ کا نکاح فوراً جاوید بھائی سے کردیا جائے۔اس مسئلہ پر شرعی حکم کیا ہے یہ جاننے کے لیے بڑے ماموں جان ،والد صاحب اور خالو جان کو لے کر مولانا عبدالسلام کے گھر گئے۔مولانا نے ساری باتیں غور سے سننے کے بعد کہا کہ طلاق کی ضرورت نہیں ہے۔لڑکی خلع لے لے گی۔مولانا نے خلع کے کاغذات تیار کردیئے اور ظہر کے بعد چند معزز حضرات کی موجودگی میں خلع کی کاروائی مکمل ہوگئی۔اس کے بعد فوراًبشریٰ باجی کا نکاح جاوید بھائی سے کردیا گیا۔بے چارے جاوید بھائی۔ نہ گھوڑا نہ جوڑا، نہ ہار نہ سہرا،لیکن دولہا بن گئے۔

ولیمے کا اعلان تو پہلے سے ہی ہو چکا تھا۔اس کے انتظامات میں جی جان سے جٹ گیا۔میرے سر کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔اس لئے خوشی خوشی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ولیمہ صرف رشتہ داروں اور چند مخصوص لوگوں کے لیے تھا۔وہ فارغ ہو کر جلد ہی رخصت ہو گئے۔

کام سے فارغ ہو کر میں بڑے ماموں جان کے تالاب کے کنارے سمنٹ کے بینچ پر بیٹھا سستا رہا تھا۔ جیب سے پرنس ہنری کا تمبا کو نکال کر سگریٹ رول کر ہی رہا تھا کہ اچانک میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں چونک پڑا ،تاروں کی روشنی میں جاوید بھائی کو پہچان لیا۔

''لاؤ میرے لیے بھی سگریٹ بناؤ۔''نہایت شفقت اور خلوص سے انھوں نے فرمائش کی۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں ۔لیکن آپ یہاں اس وقت کیسے؟ آپ کو تو....''

''میں تمھارے احسان کا شکریہ ادا کرنے تمھیں ڈھونڈتا یہاں چلا آیا۔''

''استغفر اللہ۔احسان کیسا بھائی جان، یہ تو میرا فرض تھا۔''

یہ تیس سال پہلے کی بات تھی اور آج جب میں ایک تازہ قبر کے پاس کھڑا فاتحہ پڑھ رہا تھا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، میں چونک پڑا، یہ جاوید بھائی تھے۔،سوگوار اور غمگین۔ابھی ابھی ہم نے اپنی پیاری بشریٰ باجی کو منوں مٹی تلے دفن کیا تھا۔کل رات زچگی کے وقت ان کا انتقال ہو گیا تھا۔لوگ مٹی دے کر جا چکے تھے۔ میں فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ بے موسم برسات ہو گئی تھی ۔ڈوبتے سورج کی زرد کرنیں گیلے پتوں پر عجیب غم ناک سماں پیدا کر رہی تھیں۔جاوید بھائی میرا ہاتھ پکڑے ہوئے قبرستان سے باہر آئے اور گویا ہوئے ''اختر! تمھارا احسان ہم لوگ کبھی نہیں بھولے ،مرحومہ روزانہ اس کا ذکر کرتی تھیں ۔ یہ تمھارا ہی احسان تھا کہ گزشتہ تیس سال تک ہم دونوں نے بڑی خوش حال زندگی گزاری۔مرحومہ کے نہ ہونے کا صدمہ تو زندگی بھر رہے گا لیکن جو زندگی ہم نے جی وہ تمھاری مرہونِ منت ہے۔''

انھیں ٹوکتے ہوئے میں نے کہا ''ارے بھائی جان! یہ کیا احسان احسان لگا رکھا ہے۔یہ تو میرا فرض تھا،بس ....اور میں سوچ میں پڑ گیا ،کیسا احسان اور کیسا فرض۔

☆☆☆

ایم۔اے۔احد
73.SstyaNagar,
Bhubaneswar-751007

افسانہ

احسان

پچیس دسمبر کی سرد رات کا آخری پہر تھا۔ میں کافی تھک گیا تھا اور مجھے بہت نیند آرہی تھی۔ مجھ پر خالو جان نے سارے کام کی ساری ذمہ داری ڈال رکھی تھی۔ میں صبح ہی سے مسلسل کام کررہا تھا۔ قصاب کے یہاں سے گوشت بنوا کر لایا' باورچی کوفرمائش کے مطابق سامان مہیا کروایا، درزی سے دولہا کا سوٹ لایا اور اسے دھوبی سے پریس کروا لایا وغیرہ۔ یہ تمام کام میرے ذمہ تھے۔ اس سلسلے میں جب میں باہر نکلتا تو دوسرے لوگ بھی اپنی اپنی فرمائشیں تھما دیتے۔ کسی کو بچے کا جوتا تو کسی کو موزہ، کسی کو پرفیوم تو کسی کو ربن کی ضرورت تھی۔ میں کسی کی بات ٹال نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مہمانوں کے اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کی جگہوں کو آراستہ کرنا بھی میں نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ آخر میری پیاری بشریٰ باجی کی شادی تھی۔ خالہ جان کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ خالو جان کو مجھ پر پورا اعتماد تھا۔ شامیانہ لگ چکا تھا۔ مسندیں بھی تیار تھیں۔ تمام ہال کو پھولوں کے گلدستوں اور بیلوں سے سجایا گیا تھا۔ اسٹیج کے سامنے ایک فوارہ بھی لگایا گیا تھا۔ میرا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ اب ذرا میں کمر سیدھی کرنا چاہتا تھا کیونکہ صبح ہوتے ہی پھر بھاگ دوڑ کرنی تھی۔

لیکن سونے کی جگہ کہاں تھی۔ شادی کا ماحول تھا۔ سب تھک ہار کر جہاں جگہ ملی سو گئے تھے۔ میں جگہ کی تلاش میں تھا کہ ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے رفیق چچا نمودار ہوئے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی بولے "ارے اختر! تم اب تک جاگ رہے ہو؟"

"ہاں چچا جان! کام بہت تھا، اب جا کر نپٹا ہے۔ میں ذرا ستانا چاہتا ہوں"۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں! میں مسجد جا رہا ہوں تم میرے بستر پر ہی سو جاؤ"۔

میں ادھر ادھر دیکھے بغیر ہی چچا جان کے بستر پر دراز ہو گیا۔ میری ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ لوگوں کے دوڑنے بھاگنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کسی نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا۔ آنکھ کھلی تو ماموں جی کہہ رہے تھے "اٹھ بیٹا! بڑا غضب ہو گیا"۔

"کیا ہوا ماموں جی؟" میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"بارات نہیں آئی"

"مطلب؟"

"دولہا شادی کرنے سے انکار کر رہا ہے۔"

"واقعی غضب ہو گیا۔" میں آنکھ ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

گھڑی دیکھی تو دس بج رہے تھے، میں باہر نکلا، سب لوگ حیران و پریشان نظر آرہے تھے۔ ڈیوڑھی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگ گروپ بنا کر آپس میں چہ می گوئیاں کر رہے تھے۔ ماموں جی خالو جان کے کمرے کی طرف بڑھے تو میں بھی ان کے پیچھے چل دیا۔ اندر کا منظر نہایت ہی دردناک تھا۔ خالو جان بے اختیار رو رہے تھے۔ میرے والد انھیں سمجھا رہے تھے۔ بڑے ماموں جان، میری والدہ، ماموں جی، رفیق چچا وغیرہ کمرے میں گم صم اور افسردہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ باہر مہمانوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اچانک بڑے ماموں بول پڑے "پریشانی کی کوئی بات نہیں، بشریٰ کا نکاح ابھی ہوگا۔ خاندان میں ہی کسی لڑکے کا انتخاب کرنا ہوگا"۔

"کیسے؟" خالو جان نے اپنے سرخ چہرے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"دیکھتے ہیں" ماموں جان نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ لوگ منتظر تھے کہ بزرگ حضرات کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ایک عدد دولہے کی تلاش ہو رہی ہے اور شادی ابھی ہوگی۔ اس بات سے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اٹھے۔ لوگوں کی چہ می گوئیوں کی آواز تیز ہو گئی۔

ادھر بڑے ماموں جان، ماموں جی، میرے والد، رفیق چچا، وکیل چچا، مولانا عبدالسلام وغیرہ خاندان کے معتبر بزرگ سر جوڑ کر بیٹھے تھے کہ خاندان میں کون کون سے لڑکے ابھی شادی کے لائق ہیں۔ تین نام زیر غور تھے۔ بشریٰ باجی کے پھوپھی زاد بھائی رضوان، ماموں زاد بھائی جاوید اور خالہ زاد بھائی اختر یعنی کہ میں خود۔ یہ سن کر میں وہاں سے کھسک گیا اور گھر چلا آیا۔

رضوان بھائی میٹرک پاس کرنے کے بعد فی الحال کچھ نہیں کر رہے تھے۔ جاوید بھائی سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے لیکن کسی ضروری کام سے کل رات ہی کہیں باہر چلے گئے تھے۔ جہاں تک میرا سوال تھا، اس ماحول میں میں ہی موجود تھا لیکن میں بھی برسرِ روزگار نہیں تھا۔ ایم۔ کام کا فائنل ایئر تھا۔ جیوری نے اتفاق رائے سے اختر کے نام پر مہر لگا دی۔ یہ سنتے ہی میری تلاش شروع ہوئی۔ مجھے آس پاس نہ پا کر مجمع میرے گھر آ پہنچا اور مجھے دھر دبوچا۔ میں لاکھ کہتا رہا "بشریٰ باجی میری بڑی بہن ہیں۔" لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ ماموں نے

سمجھاتے ہوئے کہا ''دیکھ بیٹا! یہ خاندان کی عزت کا سوال ہے، تم انکار نہیں کر سکتے۔''

''مگر ماموں جی! وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑی ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ تو سنتِ رسول ہے۔ حضورﷺ نے بھی خود سے بڑی خدیجہؓ سے نکاح کیا تھا۔'' مولانا عبدالسلام نے جو میرے استاد رہ چکے تھے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''مولانا نے درست فرمایا۔ تم اپنے خالو کی پریشانی اور بے عزتی کا بھی تو خیال کرو''۔ میرے والد نے تائید کی۔

''ہاں میاں! عزت و ناموس کا معاملہ ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی کیا بات ہے''۔ بھیڑ میں سے کئی آوازیں ابھریں۔ سارے لوگ گویا مجھ پر پل پڑے۔ لوگوں کے دباؤ اور اصرار کے سامنے میں مجبور ہو گیا۔ لوگ مجھے گود میں اٹھائے لے چلے۔ کنواں کے پاس غسل دلایا۔ دولہا کا جوڑا پہنا کر اور سر پر عمامہ و سہرا لگا کر جائے تقریب پر پہنچ گئے۔ وہاں قاضی، وکیل گواہ سب تیار تھے۔ دو منٹ میں نکاح انجام پذیر ہوا اور لوگ کھا پی کر چل دیے۔

بھیڑ کم ہوئی تو مجھے اپنے سر پر رکھے ہوئے پہاڑ کا اندازہ ہوا۔ کس منہ سے بشریٰ باجی کا سامنا کروں گا۔ انھیں کیا کہہ کر مخاطب کروں گا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سوچ سوچ کر سر میں درد ہونے لگا۔ آخر دلہن کی رخصتی کا وقت آ گیا۔ باراتی اور ساراتی ایک ہی کنبے کے لوگ تھے اور جن حالات میں یہ شادی ہوئی تھی اس سے سب کی آنکھیں نم تھیں۔ جب خالو جان نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا ''بیٹا! تیرا بڑا احسان ہے''۔ میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ میں بہ مشکل اتنا ہی کہہ پایا ''خدا کے لیے ایسا نہ کہئے خالو جان! یہ تو میرا فرض تھا''۔

ہمارا گھر چھوٹا تھا اور پھر اچانک اس شادی سے کوئی انتظام بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اس پر بڑے ماموں جان نے بڑی فراخ دلی سے اعلان کیا کہ سر دست دولہا دلہن ان کی حویلی میں قیام کریں گے اور کل ولیمے کا انتظام بھی وہیں رہے گا۔ اب جس کا جو جی چاہے کرے، پریشانی تو میری تھی۔

ماموں جان کی حویلی کی دوسری منزل پر ایک کمرے کو ہماری شبِ عروسی کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ بستر پر ایک نئی چادر بچھی تھی۔ دیواروں پر گلدستے لگے تھے۔ جب مجھے اس کمرے میں بھیجا گیا تب تک میں فیصلہ کر چکا تھا مجھے کیا کرنا ہے۔ بشریٰ باجی کپڑے کی ایک گٹھری بنی بستر بیٹھی سسک رہی تھیں۔ میرے جاتے ہی وہ چونکی ہو کر سمٹ گئیں۔ میں نے نہات خوشدلی سے کہا ''السلام علیکم بشریٰ باجی، ارے یہ کیا آپ رو رہی ہیں، لاحول ولا، ارے بھئی، آپ تو بہت خوش قسمت ہیں کہ کچھ نہیں ہوا، آپ بے فکر رہیں، ان بھاری بھرکم لباس کو کھول کر رکھ دیں اور آرام سے سو جائیں۔ اطمینان رکھیں کل انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ کی دنیا آباد ہو جائے گی، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں بھی اسی کمرے میں صوفے پر سو رہوں گا''۔ وہ بالکل خاموش رہیں میں صوفے پر ایک چادر بچھا کر خاموشی سے لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا مجھے کیا کرنا چاہئے۔

مجھے معلوم تھا کہ بشریٰ باجی اور جاوید بھائی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور جب بشریٰ باجی کا رشتہ دوسری جگہ طے ہوا تو دونوں رنجیدہ تھے۔ لیکن یہاں انکار یا احتجاج کی گنجائش نہیں تھی۔ اس سے بچنے کے لیے عین شادی کے دن جاوید بھائی کوئی بہانہ بنا کر غائب ہو گئے۔ مجھے یقین تھا رات وہ گھر لوٹ آئیں گے۔ سب سے پہلے ان سے ملنا تھا۔

رات بہت کم سو پایا، علی الصبح آنکھ کھلی، کمرے کی بتی جل رہی تھی اور بشریٰ باجی لحاف اوڑھے آرام سے سو رہی تھیں۔ آہستہ سے دروازہ کھولا اور دبے پاؤں باہر آ گیا۔ فوراً جاوید بھائی کے مکان کی طرف چل پڑا۔ جب دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ گہری نیند میں تھے۔ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں انھوں نے پوچھا ''کون ہے؟''

''میں ہوں اختر۔ بھائی ذرا دروازہ کھولو۔''

''یہ کیا تک ہے یار! اس کڑاکے کی ٹھنڈ میں اتنے سویرے کوئی کسی کو جگاتا ہے کیا۔'' دروازہ کھولتے ہوئے انھوں نے کہا۔

''سنو میرے بھائی! بہت اہم بات ہے، پہلے ذرا سگریٹ تو نکالو''۔

سگریٹ سلگا کر ہم دونوں بستر پر ہی بیٹھ گئے۔

''پہلے یہ بتاؤ کل تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کچھ پتہ بھی ہے کل یہاں کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟ بتاؤ۔ تم اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟... اور میں... میں ...تم تو جانتے ہو۔ میں بہت اداس تھا۔ بشریٰ کی شادی تھی۔ یہاں سے بہت دور ...ساحل سمندر پر بیٹھا اپنی اداسی کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا''۔

''اگر تم کل نہیں گئے ہوتے تو کل تمھاری مراد پوری ہو گئی ہوتی۔ خیر... اب تم کمر کس لو اور غور سے میری بات سنو۔''

میں نے تفصیل سے انھیں ساری بات بتا دی اور انھیں کیا کرنا ہو گا یہ بھی سمجھا دیا۔ میری تجویز سن کر انھیں جو خوشی ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔ ان کے چہرے پر رونق سی آ گئی۔ ان کی رضامندی سے مجھے اطمینان ہوا۔ اب مزید میرا وہاں رکنا فضول تھا۔ جو کرنا تھا انھیں ہی کرنا تھا۔ میں نے ان سے اجازت طلب کی اور بڑے ماموں جان کے مکان پر لوٹ آیا۔ ماموں جان مارننگ واک سے واپس آ کر اخبار دیکھ رہے تھے۔ میں نے انھیں قریب جا کر سلام کیا۔

''ارے اختر! تم اتنے سویرے اٹھ گئے، خیریت تو ہے؟'' انھوں نے تشویش ظاہر کی۔

''جی ماموں جان، سب ٹھیک ہے۔ میں آپ سے ایک ضروری بات

(بقیہ صفحہ 54 پر)

افسانچے

رؤوف خوشتر

09538445870

مطیع وفرماں بردار

اپنے بچپن کی سہیلی شاہانہ سے مل کر دُردانہ بہت خوش ہوئی اور اسے اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہنے لگی۔

''جانتی ہو ہم پورے دس سال بعد مل رہے ہیں۔والدین کے ہمراہ میں گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر آ گئی۔تعلیم ختم ہونے کے بعد میری شادی ہوگئی۔میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے بے حد پیار کرنے والے شوہر نصیب ہوئے ہیں۔وہ میری ہر خواہش و فرمائش کو پوری کرنے میں اپنی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ادھر میں نے کچھ مانگا وہ مجھے فوراً لا کر دیں گے۔میری دعا ہے کہ تمھیں بھی ایسا ہی شوہر نصیب ہو۔تم تو بچپن سے ہی بہت خوبصورت تھیں اب ماشاءاللہ حور لگ رہی ہو۔تمھارا انداز بھی ویسے ہی شاہانہ ہے۔لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ نام کا اثر ہوتا ہے''۔دُردانہ نے کہا۔

''دُردانہ!اب میں گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں رہنے کے لئے آئی ہوں۔ ارے یہ سُن کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔شاہانہ میری تو یہ دعا ہے کہ اب ہم زندگی بھر ساتھ رہیں اور کبھی نہ بچھڑیں''۔اس پر دونوں سہیلیوں نے گلے ملتے ہوئے آمین کہا۔

اللہ کی اِس بندی کی خلوص دل سے مانگی ہوئی دعا کو اللہ کے ایک بندے نے سُن لی اور اس دعا کو یوں عملی جامہ پہنایا کہ ایک مہینہ بعد اِس نے شاہانہ سے شادی کر لی۔ اور اللہ کا یہ بندہ دُردانہ کی ہر خواہش وفرمائش اور تمنا کو پوری کرنے والا اِس کا وفادار شوہر تھا۔

☆☆☆

صادق علی انصاری

Nasheman 198-A
Shaikh Sarai
Sitapur-261001(U.P)

آج کا عالم

دُنیا والوں کو ڈراتا تو خوب ہے، مگر ڈرتا بالکل نہیں۔

مدرسہ

ایک بھی طالب علم غریب، نادار و یتیم مدرسے میں نہیں ہے۔ہر بچے سے قیام وطعام کی بابت فیس وصول کی جا رہی ہے۔پھر بھی مدرسے کا پیٹ نہیں بھرتا۔چنانچہ ہر سال عید کے اور بقرعید کے موقع پر مدرسہ والے زکوٰۃ کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

متشاعر

سمندر پار کی دنیا میں زندگی بہت مصروف ہو کر رہ گئی ہے۔چاہتا ہوں کہ گھر والوں کو اور دوستوں کو الگ الگ تفصیلی خط لکھوں لیکن موبائل سے ہی کام چلا لیتا ہوں اور ٹی۔وی۔سے اخبار اور میگزین کا کام لے لیتا ہوں۔

یار!تم نے تو کمال کر دیا۔لال قلعہ کے یوم جمہوریہ کے مشاعرے میں تم نے تین عدد غزلیں پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔واقعی تم نے کمال کیا ہے۔آج کل کلام کسے دکھا رہے ہو۔کچھ توقف کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی، تمھیں معلوم ہونا چاہئے۔اس وقت میرے پانچ شاگرد ہیں۔

جدید کاری

جانے کتنی آرڈنیری ڈاک ندی نالوں کی نذر ہو جاتی ہیں۔آئے دن اخبار میں خبریں آتی رہتی ہیں، پوسٹ مین پکڑے جاتے ہیں لیکن ادھر قریب دو ڈھائی ماہ سے میں دیکھ رہا ہوں کہ ڈیوٹی ٹائم کے بعد، اتوار و دیگر سرکاری چھٹیوں میں بھی ڈاک پابندی سے بانٹی جا رہی ہے یہ تعجب کی بات ضرور ہے۔

اس بڑے علاقے میں تین عدد پوسٹ مین تعینات ہیں، بڑی لاپرواہی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں۔انتظامیہ سے کئی بار میٹنگ میں اور کبھی کبھار تحریری گزارش بھی کی گئی کہ علاقہ بہت بڑا ہے اسے کم از کم تین سیکٹرس میں تقسیم کر دیا جائے اور ڈاک ملازمین کی تعداد بڑھا دی جائے لیکن انتظامیہ کی طرف سے کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

علاقے کے پوسٹ مین اپنی اپنی جگہ بہت پریشان، تینوں پوسٹ مینوں نے آپس میں رائے مشورہ کر کے ایک راستہ نکال ہی لیا۔

ایک بے روزگار نوجوان گریجویٹ کو چھ ہزار روپے ماہ پر ساری ڈاک بانٹنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔بے روزگار نوجوان کو نوکری تو نہیں ملی لیکن فی الحال کام تو مل ہی گیا۔وہ اکیلا تین ملازمین کا کام انجام دے رہا ہے۔تینوں پوسٹ مین گھر بیٹھے آرام سے تنخواہ لے رہے ہیں۔ ☆☆☆

غــــزلیـــــات

ڈاکٹر مسعود جعفری
Shaikhprt.Hyderabad
Mob-9949574641

ہمارے نقشِ قدم پر چلے زمانہ بھی
اسی لیے تو رکھا ہی نہیں ٹھکانہ بھی
ہماری کشتیاں ڈوبیں کہاں سمندر میں
رہا ہے ان پہ دعاؤں کا شامیانہ بھی
پرندے دھوپ بھی اپنے پروں میں رکھتے ہیں
نکھر گیا ہے ہرا رنگِ آشیانہ بھی
خود اپنی راہ بناتے ہیں لوگ ہمت سے
پرانی بات ہے قسمت کو آزمانا بھی
تمہارے پاؤں تھرکنے لگیں گے سبزہ پر
مری غزل کو اسی وقت گنگنانا بھی
کہاں سے جیت سکے گا وہ جنگ دشمن سے
اسی کے ساتھ ہے ہاتھی پہ اب زنانہ بھی
وہیں پہ بیٹھ کے تازہ غزل سنا دینا
کھلے گا جعفریؔ اک دن شراب خانہ بھی

ڈاکٹر سید مجیب الرحمن بزمیؔ
Homoeo Shifa Khana
Rahmat Colony Doranda
Ranchi-834002

ابر و خمیدہ گیسو پُر خم
صید نہ کیوں ہو ابن آدم
کتنا حسیں ہے پیار کا موسم
بادل، بجلی، کہرا، شبنم
کس کو سناؤں غم کا فسانہ
کوئی نہیں ہے اپنا ہمدم
عشق کی فطرت سہمی سہمی
آج مزاجِ حُسن ہے برہم
دیکھ کے ان کو دل نے سوچا
پھول سے رُخ پہ کاش ہو شبنم
ہنستے ہنستے رو دیتا ہے
بزمیؔ کا ہے اور ہی عالم

محفوظ اثر
C/o.IslamiaHighSchool&Junior
College,Mominpura,Nagpur

نشّے میں خود نمائی کے بدنام ہو گیا
مشہور تھا وہ شخص جو گمنام ہو گیا
چھائی تھی سرد مہری تو انمول تھا گہر
بازار گرم ہوتے ہی بے دام ہو گیا
خوش فہمیوں نے اس کی اُسے کر دیا تباہ
ورثے میں گھر ملا تھا جو نیلام ہو گیا
ہونٹوں سے اپنے جام لگایا تھا ایک بار
اس دن سے میکدہ ہی میرے نام ہو گیا
دانشوروں کے ذہن پہ غالب ہے آج جھوٹ
سچ بولنا بھی باعثِ الزام ہو گیا
یہ فیض میری ماں کی دعاؤں کا ہے اثرؔ
دُشمن مجھے مٹانے میں ناکام ہو گیا

رحمت علی رحمتؔ
Waliganj.Ara-802301
Bhojpur(Bihar)

زمانہ ساز سیاسی دماغ رکھتا ہے
وہ چہرہ ساز مگر دل میں داغ رکھتا ہے
وہ زندہ دل ہے کہ اس عہد کا المیہ ہے
غموں کی بھیڑ میں دل باغ باغ رکھتا ہے
بس ایک آن میں تالاب بھر کے لے آیا
گداگری میں وہ ایسا دماغ رکھتا ہے
انانیت کا پرستار آدمی اب کے
زمیں پہ رہ کے فلک پر دماغ رکھتا ہے
کسی قبیلے کے لائق نہیں رہے گا کبھی
میور پنکھ جو دم میں وہ زاغ رکھتا ہے
فقیہِ وقت ہے اس عہد کا وہی رحمتؔ
اندھیری شب میں جو در پر چراغ رکھتا ہے

صابرؔ ادیب
35-Gulkada.Opp:KachhiMasjid
Shajahanabad.Bhopal-462001

ہر اک لہجے میں ہے دکھ درد پنہاں رحم کر مولا
ہمارا عہد کیوں ہے خوں بداماں رحم کر مولا
محبت، دوستی، اخلاص، چاہت، انس، غم خواری
یہ سب انسانی قدریں کیوں ہیں بے جاں رحم کر مولا
جو کل تھے ہم نوا، ہمدستِ انساں، ہم سخن، ہمدم
وہ سب کیوں آج ہیں دست وگریباں رحم کر مولا
دعا دی تھی کبھی جس نے مجھے آباد رہنے کی
وہی اب بن رہا ہے دشمنِ جاں رحم کر مولا
ہماری ارتقا کی نذر کتنی ہوگئیں قدریں
یہ بیٹے باپ سے ہیں کیوں گریزاں رحم کر مولا
اِدھر غارت گری ہے تو اُدھر ہے قتل و خوں صابرؔ
ہوا ہے کس قدر حیوان انساں رحم کر مولا

کرشن پرویز
KHARAR.Dist.Mohali(Pb)140301

پردہ رخ روشن سے ہٹا کیوں نہیں دیتے
ہر ذرّے کو خورشید بنا کیوں نہیں دیتے
میری ہی طرح تم سے لپٹ جاتی ہے یہ بھی
گستاخ ہواؤں کو سزا کیوں نہیں دیتے
ٹوٹے ہوئے خوابوں کو ترے شہر کے تاجر
شیشے کی دکانوں میں سجا کیوں نہیں دیتے
بے رنگ سا ہے موسمِ گل میں بھی گلستاں
ہر پھول کو تم اپنی قبا کیوں نہیں دیتے
پرویزؔ ترا دل ہے جہانگیر کا دربار
انصاف کی زنجیر ہلا کیوں نہیں دیتے

وحیدراز کاریگر

محلّہ شہاب الدین گرمٹکال۔585214(کرناٹک)

شاخ سے ٹوٹا نہیں تھا
''میں کبھی تنہا نہیں تھا''
جب خفا تھا وقت ہم سے
دور تک سایہ نہیں تھا
دَور ایسا آگیا ہے
یہ کبھی سوچا نہیں تھا
منزلِ مقصود پر بھی
خود کو میں بھولا نہیں تھا
نقش تھا گھر کا زمیں پر
ہاتھ میں پیسہ نہیں تھا
روبرو تھا ایک دریا
کوئی بھی پیاسا نہیں تھا
رازؔ سچ کے آئینے میں
جھوٹ کا چہرہ نہیں تھا

B-7,IndustrialEstate.Partapur
Merrut-250103(U.P)
Mob-9358400900

جب طبیعت مگن نہیں ہوتی
رغبتِ فکر و فن نہیں ہوتی
اپنا مرغوب کام کرتے ہوئے
رات دن میں تھکن نہیں ہوتی
روزی روٹی کی فکر لاحق ہو
فکرِ شعر و سخن نہیں ہوتی
ہمہ تن جب بھی انہماک نہ ہو
کبھی تکمیلِ فن نہیں ہوتی
رات دن وہ بجھا سا رہتا ہے
جس کے دل میں لگن نہیں ہوتی

ڈاکٹر کلبِ حسن حزیںؔ

SakrawarEast.Tanda
AmbedkarNagar-224190(U.P)
MOb-9838084149

میں عشق کی دنیا کا مشتاق و شیدائی
جس درجہ ہے دانائی اس درجہ ہے رسوائی
وارفتگی میری ہے اک طرز جداگانہ
برداشت نہیں ہوتی صحرا میں بھی تنہائی
خوابوں میں اسی کا ہی آیا ہے نظر چہرہ
جب بھی شبِ فرقت میں مجھ کو کبھی نیند آئی
جب آگ لگی گھر میں اس وقت اکیلا تھا
دنیا تھی کھڑی اس دم جیسے ہو تماشائی
یادوں کی کسک دل میں اٹھتی ہے مرے اس دم
جب وقتِ سحر چلتی ہے جھوم کے پروائی
دل میرا دھڑکتا ہے اے جانِ بہاراں پھر
حیرت سے میں تکتا ہوں جب بھی تری برنائی
ہر بات میں ہوتی ہے تکرار حزیںؔ صاحب
فکروں میں نہیں ہوتی ان کے کبھی یکجائی

ڈاکٹر یوسف صابرؔ

RauzBagh,Aurangabad-431001(M.S)

یہ تیرے لب ہیں یا مصرعے غزل کے رومانی
تیری آنکھیں ہیں یا مصرعے رومانی
تیری زُلفیں ہیں یا استاد شاعروں کا کلام
تیرا چہرا ہے یا صورت غزل کی پیانی
تیرے رخسار رباعی قطعہ ہے رنگ تیرا
یہ تیرا جسم ہے یا غزل کی روحانی
تیری آواز ترنم تیرے انداز نظم!!
دیکھ کر ہوتی ہے پڑھنے میں تجھ کو آسانی
تیری سیرت میں غزل کا ہے مقطع صابرؔ
ہے تیرا پیار تخلص' وفا قربانی!!

مرغوب اثر فاطمی

RoadNo-7,MohallaAliGanj.G.ayaBihar
Mob-9431448749

وہ آنے کو ہیں، آجائیں، طبیعت کچھ سنبھل جائے
اگر ہے موت بھی آنی تو تھوڑی دیر ٹل جائے
یہ مانا وقت بدلا، رنگ بدلے آپ کے حضرت
پسینہ میرے حصے میں ترے حصے میں پھل جائے
ذرا سنگینیٔ حالات کی سدھ لے دلِ ناداں
ہو محوِ خواب تُو اور وقت اپنی چال چل جائے
وہ خالق بھی محافظ بھی ہے اس کا فیصلہ برحق
کہاں بھیجے ابابیلیں کہاں ٹڈّی کا دَل جائے
سمندر نے ہماری تشنگی سے رائے مانگی تھی
کہا ہے زندگی نے جب بھی جائے برمحل جائے
اثرؔ چل گاؤں سے لے آئیں تھوڑا صبح کا منظر
ادھر میٹھی اذاں گونجے ادھر کھیتوں میں ہل جائے

تجمل شفائی

Kagzipura,Po.Erandol
Dist,Jalgawn-425109(M.S)

چھاؤں سے رشتہ توڑ دیا ہے
دھوپ سے اتنا پیار ہوا ہے
لوگ یہ کتنے چیخ رہے ہیں؟
شاید کوئی قتل ہوا ہے!
راہوں کے خطرات عجب ہیں
رہزن خود بھی لوٹا گیا ہے
شہر ہو یا بستی ہو کوئی
شیرازہ ہی بکھرا ہوا ہے
یہ پردیسی ہیں یہ کیا جانیں
کون ہے اچھا کون بُرا ہے
گھر کی باتیں گھر میں تجمّلؔ
باہر تو طوفان کھڑا ہے

طاہر حسین طاہر

H.No:2-7-64,Khadakpura
Naded-431607

کون آخر حدوں کے اندر ہے
ہرکوئی خواہشوں کا خوگر ہے
ہاتھ میں ہر کسی کے پتھر ہے
شہرِ نو کا عجیب منظر ہے
زندگی کی حسیں مسافت میں
گھات ہی گھات ہرقدم پر ہے
ہوکے نزدیک بھی نہیں ملتا
جانے کس بات کا اسے ڈر ہے
پاس جن کو نہیں وفاؤں کا
ان سے ترکِ وفا ہی بہتر ہے
غم سے جو آشنا نہیں طاہر
دل وہ دل نہیں ہے پتھر ہے

اجمل محسن (ایڈوکیٹ

H.No:1-9-1053,PostalColony
Subedari.Warangal-506001(T.S)

تمام رات مجھے اضطراب میں رکھا
''وہ ایک پھول جوتم نے کتاب میں رکھا''
تھے زندگی کے کئی باب اور بھی لیکن
رکھا بھی پھول تو الفت کے باب میں رکھا
چمن میں یوں تو کئی پھول تھے کھلے لیکن
گلاب ہی کو مگر انتخاب میں رکھا
خطوط سارے ہی ان کے بڑے جتن کے ساتھ
چھپا کے جوہی' چمیلی' گلاب میں رکھا
حسین و شوخ تو پہلے بھی تھی بہت لیکن
لگادی آگ قدم جب شباب میں رکھا
پتہ چلے نہ کسی کو کہیں غمِ دل کا
بہت ہی راز بڑے احتجاب میں رکھا
بچھائیں راہ میں محسن کے اس نے گر آنکھیں
تو دل نکال کے ہم نے جواب میں رکھا

مظہر محی الدین

MakhdoomManzil.Ganeshpaeth
Hubli-580020(Karnataka)
Mob-9448326670

ڈر کی نعمت سے جومالامال ہے
مرتبہ ''کل'' اس کا حسبِ حال ہے
فون، ٹی وی، واٹس اپ، سب کی پسند
گھر کی کیفیت سے دل بد حال ہے
فکرِ عقبٰی جان ہے ایمان کی
دولتِ دارین استقلال ہے
ہر طرف بکھراؤ کی صورت گری
جو بھی صورت ہے وہ حسب حال ہے
وقت کی لا ریب یہ آوازِ حق
قوم کی شیرازہ بندی ڈھال ہے
مسئلوں میں ہم کو اُلجھانے کی ضِد
قومِ باطل کی پرانی چال ہے
قوت و طاقت سے مظہر ربط رکھ
حرفِ روشن آب دارِ لعل ہے

مضطر مچھلی شہری

At:Mahtwana.P.O:MachhliShaher
Jaunpur-222143(U.P)

جانتے ہیں سبھی کون انجان ہے
زندگی چار ہی دن کی مہمان ہے
ضد نہ کیجئے خدارا ٹھہر جایئے
رات بے نور ہے راہ سنسان ہے
اب سزا اس کو دینا مناسب نہیں
جو خطاؤں پہ اپنی پشیمان ہے
آپ ساحل پہ تشریف اب لائے ہیں
جب سفینے کے نزدیک طوفان ہے
روبرو آئینے کے نہ آپ آیئے
آئینہ ٹوٹ جانے کا امکان ہے
اس مکاں میں مجھے چھوڑ جاتے ہو تم
جس میں آنگن' منہ کھڑکی' نہ دالان ہے
سخت مشکل ہے مضطر یہ شیشہ گری
آئینے توڑ دینا تو آسان ہے

محمد امجد سلیم امجد

H,No.2-9-110,Mukarrampura
Karimnagar-505001(A.P)

کرشمے جنگ کے جبر وجدال لائے ہیں
ہمارے ملک میں فتنے اُچھال لائے ہیں
جفا پرست ہمیشہ جفا کی سازش سے
وفا خلوص کے شیشوں میں بال لائے ہیں
جدید نسل ہے اردو سے نا بلد اب تک
قدیم لوگ ہی اردو سنبھال لائے ہیں
قلم دکھایے جو قرطاس پر قلم کاری
ہم اس قلم کی ہی عمدہ مثال لائے ہیں
سخنوری میں ہنر مند ہم نہیں ہیں مگر
ہنروروں سا سخن میں کمال لائے ہیں
ہم اپنی فکر کا دریا کھنگال کر امجد
خرد کی سیپ سے گوہر نکال لائے ہیں

ظہیر احمد ظہیر گلبرگوی

H.No11-1041/66,Jeelanabad
M.S.K.Mils.Gulbarga-585103

ایسے بھی حادثات نظر سے گزر گئے
کچھ لوگ اپنی موت سے پہلے ہی مر گئے
ہر اک نظر ہماری ہی جانب اُٹھے ہے کیوں
پنگھٹ ہو یا کہ موڑ' میاں ہم جدھر گئے
غم کے سوا زمانے نے ان کو دیا ہے کیا
خوشیوں کی آرزو میں جو حد سے گزر گئے
آتے ہیں دوسروں کی مصیبت میں کام جو
ایسے ہی لوگ اپنا بڑا کام کر گئے
نفرت ملی ہے ہم کو فقط اس جہان میں
جب بھی ظہیر ملنے کو اپنوں کے گھر گئے

نائلہ شیخ فلاحی

0/301,HanjarNagar.PumpHouse
Andheri(East)Mumbai-400093

کہا ہے سچ اور پچھتائے بہت ہیں
وفا میں زخم بھی کھائے بہت ہیں
جنھیں ہم بھول جانا چاہتے ہیں
وہ ہم کو یاد بھی آئے بہت ہیں
جسے تو نے بڑے نازوں سے پالا
وہ ننھے پھول مرجھائے بہت ہیں
اکیلے ہم نہ ہوں گے زندگی میں
تمھاری یاد کے سائے بہت ہیں
گلہ غیروں سے نائلہ ہو کیوں کر
ہمیں اپنوں نے تڑپائے بہت ہیں

شاہنواز انصاری

Moh.Mhtoana.Machlisaher
Jaunpur.Mob:7398506948

پتھر دل گستاخ نظر ہے یا اللہ
وہ کیسا بے باک بشر ہے یا اللہ
دنیا کی نظروں میں ہم مجرم ٹھہرے
ظلم ہمیں پہ شام وسحر ہے یا اللہ
جس کی خاطر ہم نے دنیا چھوڑی
اس نے پھیری ہم سے نظر ہے یا اللہ
آساں نہیں ہے عشق کی رہ میں چلنا
خارِ مغیلاں کا یہ سفر ہے یا اللہ
ڈوب کے تیری چاہت میں یہ دیکھا
کوئی نہیں تجھ سے بہتر ہے یا اللہ
دور ہے منزل راہیں بھی پیچیدہ
شاہنواز انجان بشر ہے یا اللہ

نوشاد ناداں

NewStyleTallor
LawRoad,Gaya-823001

لٹکی ہوئی ہے جان پہ شمشیر وقت کی
میں بات مانتا رہا کشمیرِ وقت کی
رکھا ہے نامراد کسی کو جہان میں
سارے گھروں میں پڑتی ہے تنویر وقت کی
تم راہ میں پہاڑ بھی لاکر کھڑا کرو
ہوتی رہے گی دہر میں تعمیر وقت کی
خنجر تھا جس کے ہاتھ میں گھائل وہی ہوا
ایسی بھی ہم نے دیکھی ہے تسخیر وقت کی
آزاد اپنے فرض سے ہوتا نہیں ہوں میں
لپٹی ہوئی ہے پاؤں میں زنجیر وقت کی
ناداں محل نواب کا دنیا میں رہ گیا
دراصل میرا گھر بھی تھا جاگیر وقت کی

شارق ریاض

9/A Patwapar Lane
Kolkata-70001

آنکھوں کو ترے غم میں جگایا ہے کئی بار
اشکوں کو جوانی میں بہایا ہے کئی بار
جو راہِ صداقت سے بہت دور تھے یارو
آئینہ انھیں میں نے دکھایا ہے کئی بار
اس کو تو سمجھنے میں مجھے دیر لگی تھی
اس نے تو مرا ساتھ نبھایا ہے کئی بار
میں اپنی دعاؤں میں اثر ڈھونڈ رہا ہوں
سجدے میں سر کو اپنے جھکایا ہے کئی بار
شارق میں نہیں قوتِ پرواز مگر دیکھ
ہاتھوں سے پرندوں کو اُڑایا ہے کئی بار

سیف الرحمن عبّاد غازی پوری

Syed wara
Gazipur(U.P)233001

کتنے سفر تھے ایک سفر کے پورا ہونے تک
شمع، شرارہ، آتش ہم تھے شعلہ ہونے تک
لفظ پڑا تھا بے معنی ان گونگے ہونٹوں پر
وحشی تھے ہم سب ہی اس کے کلمہ ہونے تک
شہر کی شورش بس مجھ کو ایذا پہنچاتی تھی
زخمی زخمی رہتا تھا میں صحرا ہونے تک
حُسن کی قربت کیا ملتی بے رنگ تھے ہم خود ہی
اس کے رخساروں کا رنگیں غازہ ہونے تک
مجھ کو یزیدی ذہنوں نے یوں قید میں ڈالا تھا
بے بس تھا میں پیاس کا مارا دریا ہونے تک
میں تو بے جان کھلونوں سے ڈر جاتا تھا عبّاد
کتنا تھا نادان میں سوچو بچہ ہونے تک

ایوب عادل

MasjidMohalla.P.O:Angus
Dist:Hooghly-712221(W.B)
Mob-9681650900

ستم کی نت نئی ایجاد سے ڈراتا ہے
مرے قلم کو وہ فولاد سے ڈراتا ہے
غرور خاک میں مل جایے گا بتا اس کو
وہ باپ جو مجھے اولاد سے ڈراتا ہے
وہ آدمی جو غمِ زندگی سے عشق کرے
اسی کو تو غمِ ناشاد سے ڈراتا ہے
تجھے پتہ ہے کہ انجام کیا ہوا اس کا
تو حق پرستوں کو شداد سے ڈراتا ہے
جو وار چھپ کے کرے سامنے نہیں آیے
وہ سرفروشوں کو تعداد سے ڈراتا ہے
میں اڑتا جاؤں گا عادل بلندیوں کی طرف
اگرچہ وہ مجھے صیاد سے ڈراتا ہے

کتابوں کے شہر میں

(تبصرے کے لئے دوکاپیوں کا آنا ضروری ہے)

اگراپنی کتابوں کا اشتہار بھی دیں تو تبصرہ ترجیحی بنیاد پر جلد شائع کیا جائے گا۔ایک صفحے کے اشتہار کی شرح ایک ہزار روپے ہے۔تبصرے کے لئے کافی کتابیں جمع ہوچکی ہیں۔ان پر تبصرہ ترتیب وار شائع ہوتا رہے گا۔(ادارہ)

کتاب کا نام۔فکر کی دھوپ اور چاندنی (آزادغزلیں)
شاعر۔صابر فخرالدین مبصر۔عبدالمتین جامی

صابر فخر الدین صاحب کی شاعری میں ہمہ گیریت پائی جاتی ہے۔ یادگیر دکن سے تعلق رکھنے والے شاعر صابر کی گزشتہ پچاس سالوں سے گیسوئے اردو کوسنوارنے میں منہمک ہیں۔انھیں متعدد اصناف سخن پر قدرت حاصل ہے۔غزل سے گرچہ عشق کی حد تک لگاؤ ہے لیکن نظم' ماہیے' ثلاثی اور دوہے جیسی اصناف میں بھی ان کی تخلیقی شادابیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔آزادغزلیں اور تین مصرعی نظموں پر بھی بکثرت طبع آزمائی کی ہے۔مظہر امام صاحب کی ایجاد کردہ آزادغزل کو صحیح فارم دینے والے نظریہ ساز نقاد کرامت علی کرامت کی پیروی کرتے ہوئے انھوں نے خوبصورت آزادغزلیں تخلیق کی ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ آج جب آزادغزل رفتہ رفتہ لوگوں کے ذہن سے معدوم ہوتی جارہی ہے ایسے میں آزادغزلوں پر مشتمل زیر تبصرہ کتاب ''فکری دھوپ اور چاندنی'' شایع کرکے انھوں نے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے جو لائقِ تعریف ہے۔مناظر عاشق ہرگانوی جنھوں نے آزادغزلوں کی تشہیر میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس کتاب میں شامل اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے کہ ''صابر فخر الدین کی آزادغزلوں میں دعوتِ فکر ملتی ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ فکری شاعر اپنا خاص نظریۂ حیات رکھتا ہے''۔

صابر فخر الدین نے اپنے اس مختصر مجموعے میں تقریباً ۸۴؍آزادغزلیں شامل کی ہیں۔صابر کی شاعری میں انسانی زندگی سے وابستہ سبھی مسائل کا سراغ ملتا ہے۔ان مسائل سے نبرد آزمائی کرتے کرتے انسان کو جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے انھیں جزوِ شاعری بناکر صابر صاحب نے اپنی عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان آزادغزلوں میں چند اشعار ایسے بھی مل جاتے ہیں جن میں زندگی کے تلخ تجربات کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کی پُرفریب وادیوں کی بھول بھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔چند اشعار نموناً پیش ہیں جن میں غزلوں کے اشعار کی طرح ہی حسین تاثرات کا ایک جہان آباد ہے:۔

آپ کے شہرِ نگاراں میں تو اب بھی ایک ہی کیا
سیکڑوں گھر آئینے ہیں
گھر پر نہ تھا کوئی
جس کو بھی دیکھیے وہی خانہ بدوش تھا
حالات نے اسے بھی تو سرکش بنادیا
جو سرفروش تھا
وہ ترے قصے ہوں پیارے یا حکایاتِ زمانہ
سب ہماری داستاں ہیں

میں نے محولہ بالاسطور میں جو کچھ لکھا یا جن چند اشعار کے حوالے دیے ایسے ہی پچاسوں اشعار کا مرقع صابر فخر الدین کی آزادغزلوں میں موجود ہے اور سنجیدہ مطالعہ کا متقاضی بھی۔بعض حضرات کے خیال میں آزادغزل کی موت واقع ہوگئی ہے لیکن صابر صاحب کا یہ مجموعہ اس غلط فہمی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔امید ہے کہ تجربہ پسند حلقہ اس کی پذیرائی کرے گا۔اس مجموعے کی قیمت ہے ۱۵۰؍روپے اور شاعر کا پتہ۔بالقابل پولیس کوارٹرس۔مین روڈ۔یادگیر۔۵۸۵۲۰۱

کتاب کا نام۔ بولتے پتھر (قطعات)
شاعر۔ارشد مینانگری مبصر۔عبدالمتین جامی

بولتے پتھر تقریباً ۱۴۰۰؍قطعات پر مشتمل شعری مجموعہ ہے۔میرا اپنا خیال ہے کہ قطعات کہنا رباعی گوئی سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔رباعی اپنے اوزان کے اعتبار سے ۲۴؍اوزان پر مشتمل ہوتی ہے۔اس میں سہولت یہ رہتی ہے کہ رباعی گوئی پر عبور حاصل کرنے والا شاعر رباعیوں کے چار مصاریع میں سے کوئی بھی وزن کسی بھی مصرع میں استعمال کرنے پر آزاد رہتا ہے۔لیکن قطعات میں اس کی گنجائش نہیں۔شاعر کسی بھی بحر میں قطعہ کہہ سکتا ہے لیکن جس بحر میں بھی کہے اس کا پابند رہنا ضروری ہے۔اس لیے کسی ایک خیال کو چار مصاریع میں باندھنا اتنا سہل نہیں ہے جتنا کہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔رباعی اور قطعہ میں فرق صرف بحور و اوزان کا ہے۔حالانکہ رباعی گوئی کے لیے مطلوبہ ۲۴؍اوزان کو قابو میں کرنا بھی مشکل ترین امر ہے۔لیکن مسلسل مطالعہ اور مشق سخن سے یہ مشکل دور ہوسکتی ہے۔بہرکیف ارشد مینانگری قطعات کہنے کے سلسلے میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔انھوں نے مسلسل قطعات کہے ہیں۔حالانکہ کثرت سے غزلیں بھی کہی ہیں، کئی غزلیہ مجموعے بھی شائع ہوچکے ہیں مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ۵۵؍اصنافِ سخن سے مزین قومی یکجہتی پر ضخیم مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔گیت بھی کثرت سے لکھے ہیں۔اس سلسلے میں ان کی کاوشیں قابل رشک ہیں۔زیرنظر کتاب ''بولتے پتھر'' میں شامل قطعات

متنوع موضوعات کے حامل ہیں۔ ہر قطعہ کا عنوان بھی دیا گیا ہے۔حمد یہ اور نعتیہ قطعات کے علاوہ دیگر قطعات کے بھی عنوانات مختص ہیں۔لفظ ''ماں'' سے ان کی رغبت کا تو جواب نہیں۔قبل ازیں ''ماں'' کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوکر ادبی حلقے میں کافی مقبول ہوچکی ہے۔''بولتے پتھر'' میں بھی ماں کے موضوع پر مختلف عنوانات کے تحت ان کے ایک سو بتیس (۱۳۲/) قطعات شامل ہیں۔پھر ان میں روزہ'عید'دسہرا' اصلاحی'منطقی'رنج وغم'رومانی'سیاسی'حالاتِ حاضرہ'طنزیہ و مزاحیہ وغیرہ موضوعات کو بڑی خوبصورتی سے انھوں نے قطعہ بند کیا ہے۔قومی یکجہتی پر ایک قطعہ ملاحظہ فرمایئے۔

خوش رکھے سب کو خوش رہے سب میں۔ ا یکتا خو شنما قلند ر ہے
قطرہ ہر قطرہ اس میں کھو جائے۔ ا یکتا پیا ر کا سمند ر ہے

ارشد مینا نگری کے قطعات سے لطف اندوز ہونے کے لیے ''بولتے پتھر'' کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔صاف ستھری چھپائی' کتابت اور بہترین کاغذ کے علاوہ ایجوکیشن پبلیکیشن ہاؤس کی طباعت نے اس کتاب کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔352/صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۲۱۲/روپے ہے۔اور شاعر کا پتہ ہے: مالیگاؤں۔ناسک۔423203(مہاراشٹر)

کتاب کا نام: نئی تنقیدی جہات مصنف: عبدالمتین جامیؔ
مبصر؛ ایم۔نصر اللہ نصرؔ (9339976034)

''نئی تنقیدی جہات'' کٹک (اڑیسہ) کے معروف و بزرگ شاعر'ادیب' مبصر و ناقد عبدالمتین جامیؔ کی تازہ تصنیف ہے۔جس میں انیس نہایت ہی معلوماتی تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔جن کی انفرادی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ان مضامیں کے مطالعے سے ذہن کے تاریک گوشے روشن ہوجاتے ہیں۔علم کے جگنوؤں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی ہے۔معلومات کے اوراق روشن ہو جاتے ہیں۔ادبی دلچسپی کے سامان مہیا ہونے لگتے ہیں۔ایک خوشگوار ادبی فضا کا تابناک حصار بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ورق در ورق اور سطر در سطر خیال و فکر کے قمقمے چمکنے لگتے ہیں۔تراشیدہ جملے'استعارے و تراکیب سے مزین عبارتیں ذوقِ مطالعہ کو سیراب کرتی ہیں۔ان کے رخش خامہ میں روانی ہے اور فکر میں بالیدگی بھی۔سوچ بھی بلند اور شعور میں بھی پختگی صاف نظر آتی ہے۔

مذکورہ کتاب کے مشمولات میں جدیدیت'مابعد جدیدیت'اردو غزل کے کچھ نئے تجربے'اردو زبان کے مسائل اور ان کا حل'وزیر آغا'ڈاکٹر شکیل الرحمٰن'ظہیر غازی پوری' کرامت علی کرامت'امجد نجمی'شفق'ڈاکٹر نریش'غلام مرتضٰی راہی'ناوک حمزہ پوری'مظفر حنفی'قمر جمالی'سعید رحمانی کے علاوہ اڑیسہ میں طنز و مزاح'اڑیسہ میں تقدیسی شاعری اور عزیز اندوری پر خوبصورت اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔جن کی ورق گردانی سے ان شخصیات کے علم و فن سے واقفیت و وابستگی اور ادبی حالات و رجحان کا علم ہوتا ہے۔

ان مضامین میں ''جدیدیت مابعد جدیدت'' نہایت ہی اہم مقالہ ہے جو سولہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔۔ایک بہت ہی لمبی اور فکر انگیز بحث ہے جس میں پہلے تو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے ایسا لگتا ہے کہ ہر بیس سال کے بعد اردو ادب کو ایک نیا نام دیا گیا ہے۔کبھی رومانیت' کبھی روایت پسندی' کبھی ترقی پسندی' کبھی جدیدیت اور کبھی مابعد جدیدت اور اب جب کہ اس کے بھی بیس سال گزر چکے ہیں تو اب کون سا نام دیا جائے اس کی فکر لگی ہوئی ہے۔ جب کہ ہر عہد یا دور میں تقریباً ایک سا ادب ہی لکھا گیا ہے سوائے جدیدیت کے جس کے علاماتی ادب نے اسے بدنام کر رکھا ہے۔جامی صاحب نے یہ سوال کھڑا کیا ہے کہ اب کیا نام دیا جائے۔حقیقت یہ ہے کہ ہر عہد میں زندگی نئے رفتار سے گزرتی ہے'اسے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نئی پیچیدگیاں زندگی کے عنوان کو بدل دیتی ہیں۔افکار و خیالات میں تبدیلی آہی جاتی ہے۔انداز سخن بدلتا ہے اور ادب کے مرتب کردہ اصول بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ایسے میں صرف نام بدلتے رہنے سے کوئی نئی بات کیا پیدا ہوسکتی ہے۔اس حوالے سے یہ مقالہ کافی اہم ہے۔جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادب ادب ہے۔جس دور میں بھی ادب لکھا جائے گا اس کا رشتہ ماضی سے اٹوٹ رہے گا۔بنیادی سوالات وہی رہیں گے۔مسائل بھی تقریباً وہی ہوں گے۔زندگی کی بقا اور ارتقا ادب کا سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہمیشہ ہی بنا رہے گا۔اس لئے نام میں کیا رکھا ہے۔

دوسرا مضمون چھ صفحات پر مشتمل ہے جس کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔اس چھوٹے سے مضمون میں دو سو سال کی تاریخِ شاعری کا نہایت ہی اختصار کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے رومانیت سے لے کر مابعد جدیدت تک غزل کے پیراہن میں کیا کیا پیوند کاریاں ہوئی ہیں ان کا خوبصورت محاسبہ شامل ہے۔ رومانی غزل'ترقی پسند غزل'جدید غزل' آزاد غزل'غزل نما' کالی غزل پیلی غزل اور نہ جانے کس کس لباس میں اسے پیش کیا گیا ہے اس کی ایک تفصیل درج کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ غزل آج بھی اپنے پرانے لباس میں زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔شعرا نے رنگ بھرنے کی اپنی پوری کوششیں کی ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔مگر ولیؔ اور میرؔ و غالبؔ کی غزلوں کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے والا نہیں۔

تیسرے مضمون میں اردو زبان کے نئے مسائل'تقاضے اور حل کے تعلق سے وہی باتیں دہرائی گئی ہیں جو برسوں سے ہوتی چلی آرہی ہیں۔وہی شکوے گلے' وہی بے وطنی اور بے چارگی پہ اشک ریزی' وہی اردو اور مسلمان کا اٹوٹ رشتہ۔ ہندستان میں پیدا ہونی والی زبان دو گز زمین کے لئے ترس رہی ہے۔کوئے یار سے کوئے دار کے سفر پر گامزن ہے۔لیکن حقیقت یہی ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہے کہ خون کے آنسو بہائے جائیں۔

ان کے علاوہ شخصیات کے تعلق سے موصوف نے جو گفتگو کی ہے وہ بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔وزیرآغا کوانشائیہ نگار کی حیثیت سے جس طرح پیش کیا ہےاس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیرآغا کوانھوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہےاوران کوان کے خطوط کے حوالے سے انشائیہ نگاروں میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔حالاں کہ مکتوب نگاری اورانشائیہ نگاری دوالگ الگ اصناف ہیں۔لیکن خطوط میں درآنے والی کچھ تحاریر بھی ایسی ہوتی ہیں جوانشائیہ نگاری کے تقاضے کو پوری کرتی ہیں شاید اسی بنیاد پروزیرآغا کی انشائیہ نگاری کی طرف ان کی توجہ مبذول ہوئی ہے۔معاملہ جو بھی ہو مگر کامیاب بحث ہے مطالعے کے لائق اور معلوماتی بھی ہے۔اس مضمون میں انشائیہ نگاری سے متعلق بھی بصیرت افروز گفتگو درج ہے۔جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مختصر یہ کہ نئی تنقیدی جہات جامؔی صاحب کی ایک اچھی اور کارآمد تصنیف ہے جس کا مطالعہ قاری کے لئے سودمند ہے۔لکھنا تو بہت تھا مگر طوالت کا خوف ہے۔ مجموعی اعتبار سے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جامؔی صاحب ایک قابل‘لائق اور فائق ادیب اور شاعر ہیں وہ مترجم اور ناقد بھی ہیں۔رباعیات نگاری کے ماہر ہیں۔ ان کا مطالعہ ومشاہدہ گہرااور وسیع ہے۔وہ کسی بھی موضوع پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو اس کا حق ادا کردیتے ہیں۔زبان و بیان پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔اس لئے ان کو ہلکے میں لینا ناانصافی ہوگی۔امید ہے دیگر اہلِ قلم کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوگی اور ان کا بھرپور جائزہ پیش کیا جائے گا۔ادب ایسے ہی لوگوں سے آج بھی زندہ ہے۔ان سے کافی توقعات رکھی جاسکتی ہے۔کتاب کی قیمت ہے دوسو روپے اور مصنف کا پتہ: اردو بازار۔ڈاکخانہ پدماپور۔ضلع کٹک۔754200(اڑیسہ)

نام کتاب:۔شہرِ سنگ (شعری مجموعہ)
شاعر:۔ شرافت حسین مبصر۔عبدالمتین جامؔی

شرافت حسین کے نام نامی سے واقف شعراء وادباء کی ایک بہت بڑی تعداد ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔وہ ایک مدت سے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔معروف افسانہ نگار بھی ہیں۔زیرنظر شعری مجموعہ میں ایک حمد اور ایک نعت کے علاوہ ۱۳۴رغزلیں اور ۵رنظمیں شامل ہیں۔بیشتر غزلوں میں چھوٹی بحروں کا استعمال کیا گیا ہے۔لیکن چھوٹی چھوٹی بحروں میں کہی گئی ان کی غزلوں میں معنوی گہرائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ان میں انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی کے علاوہ حالات کی تصویرکشی‘موضوعات کی نیرنگیاں قارئین کو مسحور کردیتی ہیں۔روایت کی پاسداری کے ساتھ وہ جدیدترین انداز سے عہد حاضر کی تمام ناہمواریوں کو شعری حصہ بنایا ہے۔ احسن امام احسؔن کتاب میں شامل اپنے مضمون میں رقم کرتے ہیں کہ ’’مٹھاس کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار کہیں کہیں تلخ روپ دھارن کرلیتے ہیں۔پھر بھی خوشیوں کی نغمگی کم نہیں ہوتی۔سیدھے اور سچے جذبات کو دل پذیر انداز میں پیش کرنا ان کی خوبی ہے‘‘۔ نذیر فتح پوری کے مضمون نے مجموعے کو درجۂ اعتبار بخشا ہے۔موصوف کی نظروں میں شرافت حسین کی غزلیہ شاعری نے نئی اور پُرانی یادوں کو زندہ جاوید کردیا ہے۔

میں نے پہلے ہی لکھا ہے کہ شرافت حسین کی اکثر غزلیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں ہیں۔کم الفاظ میں کس طرح اپنے مافی الضمیر کو قارئین تک پہنچایا جاسکتا ہے شرافت حسین اس ہنرمندی سے متصف ہیں۔ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پتھروں پر تھے شبنمی قطرے۔آگ پھولوں کے درمیاں آئی
جشن تھا بلوائیوں کا رات بھر۔شکل تھی ساری ہی پہچانی سی
بلندی کا تصور ذہن میں تھا۔پسر کا نام جب شمشاد رکھا

ناچیز کے خیال میں مندرجہ بالا اشعار ان کی شاعری میں نیے امکانات کے درواکرتے ہیں۔آخر میں جو پانچ نظمیں ہیں ان میں تین آزاد اور دو پابند ہیں۔ ان نظموں میں عصری حسیت کے ساتھ طنز کا پہلو نمایاں ہے۔بہرکیف شرافت حسین کی غزلیں ہوں ان میں جاذبیت بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔احسن امام احسؔن صاحب نے اگرچہ کچھ کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے مگر مجموعی طور پر شعری محاسن حاوی ہیں اور لائقِ مطالعہ بھی۔کتاب کی قیمت ۲۰۰روپے اور شاعر کا پتہ:۔محلّہ قاضی پورہ۔ٹانڈہ۔امبیڈکرنگر۔۲۲۴۱۹۰(یوپی)

نام کتاب:۔بوند بوند لہو (شعری مجموعہ)
شاعر:۔نسیم انور ایوبی گنگوہی مبصر عبدالمتین جامؔی

زیرنظر کتاب بنام ’’بوند بوند لہو‘‘معاصر شعرائے کرام کی جم غفیر میں ایک چمکتا ہوا چہرہ محترم نسیم انور ایوبی گنگوہی کے تقریباً ۵۰۰رقطعات پر مشتمل ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے ہر قطعے میں ان کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔صوبہ اُترپردیش کے ضلع سہارن پور کی مقدس سرزمین گنگوہ جہاں ایک عرصے سے شعروسخن نیز تقدیسی شاعری کا ایک جہان آباد ہوتا رہا ہے نسیم انور ایوبی اس جم غفیر میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔قبل ازیں کہ ان کی شاعری پر کچھ روشنی ڈالی جایے میں یہ عرض کرتا چلوں کہ اب تک نعتوں کے سیکڑوں مجموعے شائع ہوچکے ہیں لیکن حمد یہ مجموعے چند ہی شائع ہوسکے ہیں۔نسیم صاحب کا ایک مجموعۂ حمد ’’بنام عظمت تمام‘‘ دو حصوں میں ہوا ہے جن میں ۵۱۸رایسے اشعار شامل ہیں جو ایک ہی قافیہ میں کہے گیے ہیں۔یہ اپنے طور پر ایک بےنظیر تخلیق ہے۔اس کے علاوہ ان کی خالص غزلوں کے دو مجموعے ’’اذان‘‘ اور ’’اضطراب‘‘ بھی شائع ہوچکے ہیں۔ان مجموعوں کی ادبی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔موجودہ عہد کے بزرگ ادیب وصحافی نیز (مدیراعلیٰ) شمعِ خیال پبلیکیشن کے تحت شائع ہونے والے ادبی جریدہ ’’راہ نما‘‘ کے ایڈیٹر حضرت زیڈ اختر صاحب رقم کرتے ہیں ’’موجودہ دور کے شعری ادب میں یا تو سطحی قسم کا موزوں مواد اور ہلکے پھلکے انداز میں طنز ومزاح کا شعری ادب تخلیق کیا جارہا ہے یا پھر زخم خوردہ‘چوٹ کھایے ہوئے اور دنیا کی آسائشی دور میں ناکام اور تھکے ہارے شعرا کا تخلیقی کلام دیکھنے میں آرہا ہے‘‘۔لیکن نسیم انور کی شاعری میں جابجا مصمّم ارادوں اور

عزم وعمل کا درس پایا جاتا ہے۔ بقول جناب زیڈ اختر ''سرزمین گنگوہ سے وہ شعری تخلیقات منظر عام پر آرہی ہیں جہاں حسرت ویاس کے ماحول میں قندیل عزم وعمل روشن کی جاتی ہے''۔

اس مجموعے میں شامل قطعات جہاں زندگی کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھاتے ہیں وہیں آج کے سلگتے ہوئے مسائل کی گرہ کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بہر کیف اس مختصر سے تبصرے میں نسیم صاحب کے قطعات میں پائے جانے والے تمام محاسن کا تذکرہ ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر اتنا کہا جاسکتا ہے یہ سبھی قطعات جہاں شاعری میں جذبۂ عبودیت کا برملا اظہار ہیں وہیں ان میں وارداتِ قلبی کے ساتھ ساتھ بھرپور عکاسی شاعر کے مجروح جذبات سے روسناش بھی کراتے ہیں۔ موصوف کے مختلف رنگوں پر مشتمل قطعات کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں: دعائیہ:۔

اللہ لب پہ اور محمدؐ کا نام ہو ۔ یارب زبان پہ میری درود وسلام ہو
مرنے لگوں تو کلمۂ طیب کا ورد ہو۔ نامِ خدا رسول پہ بس دم تمام ہو

حمدیہ:۔

تیری رضا کے بعد نہیں کچھ طلب مجھے۔ خواہش تھی جس کی مل گیا مولا وہ سب مجھے
تیری نوازشات کی امید پھر بھی ہے۔ تیری عطا کے بعد رہا صبر کب مجھے

نعتیہ:۔

خدا رسول کی الفت کا ہے وہ لطف وکرم۔ ملی ہے فکر وعمل کی نئی جہات مجھے
کرشمہ کر گئی حمد وثنائے رب ونبی۔ تفکراتِ جہاں سے ملی نجات مجھے

علمی:۔

علم انساں کے لئے آئینۂ ادراک ہے۔ ورنہ یہ سارا جہاں اک عالم فتراک ہے
علم کی خاطر بشر کو سروری بخشی گئی ۔ ورنہ انساں تو فقط اک نقطۂ ناپاک ہے

حالاتِ حاضرہ:۔

رشتے ناتے پیار قربت کی کوئی خواہش نہیں۔ آج کے انسان کی زر کے سوا کوشش نہیں
مشورہ تو مشورہ آواز تک بھی ہے گراں۔ اب مروت کی دلوں میں کوئی گنجائش نہیں

نسیم انور صاحب کے مندرجہ بالا قطعات کی ایک جھلک سے ہی ان کے جداگانہ انداز بیان کا پتہ لگ جاتا ہے۔ خوبصورت گیٹ اپ اور عمدہ کاغذ نیز مشمولات کی نیرنگیوں کی موجودگی میں ۱۴۸ رصفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت صرف ۲۵۰ روپے ہے۔ ملنے کا پتہ: نسیم انور ایوبی، محلّہ محمد غوری، گنگوہ شریف۔ ضلع سہارن پور، یوپی۔ 247341

نام کتاب:۔ مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقیدی شناخت

مرتبہ:۔ ڈاکٹر شبانہ خاتون مبصر۔ عبدالمتین جامی

مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کے تعارف میں کچھ لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہوگا۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے ان کی ادبی ظفریابیاں اس قدر پھیل چکی ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔ بہر کیف تقریباً ۲۰۰ رکتابوں کے مصنف مناظر عاشق ہرگانوی صاحب نے اپنے رسالے ''کوہسار'' کے ذریعہ سیکڑوں شاعروں اور ادیبوں کی پرورش لوح قلم میں ساتھ دیا۔ کئی نئی نئی اصنافِ سخن کو اپنے ''کوہسار'' کے ذریعہ فروغ دینے کی کوشش کی۔ سیکڑوں کتابیں تصنیف وتالیف کر کے اردو کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ بہر حال اس کتاب میں شامل ایک مضمون ''مناظر عاشق ہرگانوی ایک اہم نقاد'' کے مضمون نگار محمد متین ندوی (سرونج) نے اقبال کا ایک شعر درج کیا ہے جس کا حوالہ دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بہت مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

واقعی میں اردو کے نام پر اس طرح ہمہ تن قربان ہو جانے کا جذبہ رکھنے والے لوگ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر شبانہ کی ترتیب دی ہوئی اس کتاب میں ۳۴ رمضامین اور ۳۵ رآراء شامل ہیں۔ مضمون نگاروں میں جگن ناتھ آزاد نظام صدیقی، انور سدید، سجاد نقوی، عتیق اللہ، محمد انصار اللہ، ناصر عباس نیر، محمد محفوظ الرحمٰن، فراز حامدی، عقیل ہاشمی، آزاد گلاٹی، افتخار جمیل شاہین، منصور عمر، امام اعظم، ریاض صدیقی، سیفی سرونجی، رضوان احمد، منظر اعجاز، محمد متین ندوی، علیم صبانویدی، مظفر مہدی، ظفر ہاشمی وغیرہم کے علاوہ اور بھی کئی اصحابِ شامل ہیں ۔علاوہ ازیں گوپی چند نارنگ، وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، جمیل جالبی، گیان چند، جگناتھ آزاد، انور سدید، جوگندر پال، مظہر امام، کرامت علی کرامت، نادم بلخی، ندا فاضلی، عبدالمغنی وغیرہم نے اپنی تحریروں میں مناظر صاحب کی علمی وادبی بصیرت کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

ان تمام حضرات کے مضامین کا موضوع ہرگانوی صاحب کا تنقیدی کارنامہ ہے۔ تنقید نگاری میں مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی مختلف جہتوں کو ان مضامین میں احاطہ کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔تنقیدی دبستان کے نیے موضوع ساختیات و پس ساختیات کے علاوہ مابعد جدید پر بھی ہرگانوی صاحب نے بہت لکھا ہے جس کا ذکر بھی کئی نقاد نے اپنے مضامین میں کیا ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ان کی نظریاتی اور عملی تنقید پر خامہ فرسائی کی ہے۔ عتیق اللہ صاحب نے مناظر عاشق کی ساختیات پسندی اور علیم صبانویدی نے ان کی تخلیقی تنقید پر سیر حاصل تبصرہ خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

محترمہ شبانہ خاتون نے ''اپنی بات'' کے تحت جو مختصر مضمون قلم بند کیا ہے قابلِ تعریف ہے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''مناظر عاشق ہرگانوی کی شخصیت مثالی ہے۔ انھوں نے ہر موضوع پر اور اردو کی بیشتر اصناف پر اتنا لکھا ہے کہ یہ صرف انہیں کا حصہ ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں بلکہ اردو کے ہر نقاد اور ہر قاری کی

یہی رائے ہے''۔ڈاکٹر شبانہ خاتون کی یہ رائے ان کی ترتیب شدہ مضامین وآراء کی روشنی میں بالکل صحیح ہے۔

اس ضمن میں پروفیسر جگناتھ آزاد،مظہر امام اور پروفیسر کرامت علی کرامت کی آراء قابل اعتنا ہیں۔جگن ناتھ آزاد رقم کرتے ہیں''مناظر عاشق ہرگانوی کی تحقیقی صلاحتیں جس طرح نمایاں ہوئی ہیں ان کی بدولت ان کا شمار ہم ان اہل قلم حضرات میں کر سکتے ہیں جو مسلمہ حیثیت کے شاعر ہیں۔اور ساتھ ہی ساتھ مستند نقاد بھی ہیں اور معتبر محقق بھی۔

مظہر امام نے لکھا ہے''مناظر عاش ہرگانوی اس وقت برصغیر کے فعال ترین ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ جو کام وہ سنجیدگی سے کرتے ہیں اور جہاں وہ پاسبانِ عقل کو دل کے ساتھ رکھتے ہیں وہاں کامیابی ان کے ہم رکاب ہوتی ہے۔اوراس طرح کے کام کا اثر ونفوذ بعض مستقبل رجحانات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے''۔

پروفیسر کرامت علی کرامت کے بموجب''آپ کا تحقیقی مقالہ''عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر'' بے پناہ صوری اور معنوی خوبیوں کا حامل ہے۔یہ ایک ایسا ٹھوس کارنامہ جو ہمیشہ آپ کو زندہ رکھے گا۔اس میں آپ نے تحقیق وتنقید ودونوں کا حق ادا کردیا ہے۔''

بلاشبہ ڈاکٹر شبانہ خاتون کی یہ کتاب ہمارے دور کی ایک مثالی شخصیت یعنی ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی فہمی میں اہم کردار ادا کرے گی۔دوسو صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۳۰۰/روپے ہے۔صفحات کے لحاظ سے بے شک یہ قیمت پچھ زیادہ ہے لیکن مواد کے اعتبار سے یہ قیمت پچھ نہیں ہے۔تاہم ایجوکیشنل پبلی کیشن ہاؤس دہلی کے زیراہتمام شائع شدہ یہ کتاب دیدہ زیب،سرورق کاغذ اور چھپائی کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ممبئ،ایجوکیشنل بک ہاؤس،یونیورسٹی مارکیٹ،علی گڑھ۔

نام کتاب۔ آزادغزل ایک تجربہ مصنف ظفر ہاشمی
مرتبہ۔ عصمت خانم (زوجہ ظفر ہاشمی) مبصر۔ عبدالمتین جامی

مظہر امام صاحب نے آزادغزل کا تجربہ کیا لیکن ان کے اس تجربے کو منظر عام پر لانے میں کرامت علی کرامت نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔انھیں آزاد غزل کا نظریہ ساز بتایا جاتا ہے۔حقیقتاً انھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کا مجموعہ اضافی تنقید میں شامل ایک مضمون''جدید شاعری میں وزن وآہنگ کے مسائل''میں آزادغزل کے تخلیقی عناصر کی نشان دہی کرتے ہوئے نہایت مدلل انداز میں بحث کی ہے۔اس وقت جن نوجوان شعراء نے اس جانب توجہ کی اوراپنی تخلیقات کو مختلف مشہور رسائل میں شائع کروایا ان میں ظفر ہاشمی کا نام نامی بھی آتا ہے تاہم ان سے کچھ قبل یوسف جمال،زرینہ ثانی،بدیع الزماں خاور،سلیم شہزاد،محمد فاروق مضطر،نشاط انصاری،مسعود شمسی،فرحت قادری اور پرویز رحمانی کے اسماء گرامی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔یوسف جمال نے آزادغزل کے نظریہ ساز نقاد وشاعر کرامت علی کرامت کے ایماء پر اپنی آزادغزل کو''شاعر''ممبئ کو ارسال کیا جو سالنامہ جون جولائی ۱۹۷۲ء میں شامل کی گئی تھی۔۔لہٰذا آزادغزل کو فروغ دینے میں مظہر امام اور کرامت علی کرامت کے بعد یوسف جمال کا نام آتا ہے۔

آزادغزل پر نیا تجربہ کرنے کا سہرا مظہر امام کے سر جاتا ہے۔انھوں نے یہ تجربہ ۱۹۴۵ء میں کیا جو کہ ان کی اپنی بیاض میں محفوظ تھی لیکن اسے منصۂ شہود پر آنے کے لیے مزید ۱۴/سال تک انتظار کرنا پڑا۔اس نئی ایجاد کی خبر اس وقت منظرِ عام پر آئی جب ۱۹۵۴ء میں کرامت علی کرامت نے''اشارہ'' پٹنہ اگست کے شمارے میں اپنے مضمون''شاعر وفن کار مظہر امام''میں آزادغزل کا تذکرہ کیا اوراس نئی صنف سخن کے خدوخال پر روشنی ڈالی۔حالانکہ اس وقت تک مظہر امام کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا تھا۔چونکہ اس وقت تک کسی صنف پراس طرح کا تجربہ نہیں ہوا تھا یا کسی نے طبع آزمائی نہیں کی تھی،غالباً اسی لیے اس نئی صنف کا نام''آزادغزل'' دیا گیا۔مظہر امام نے اپنے پہلے شعری مجموعہ میں اس کو شامل اشاعت کیا تو اس پر بہت چرچا ہوا۔بعدازاں ۱۹۶۸ء کے''شب خوں''الہ آباد میں مظہر امام کی دوسری آزاد غزل شائع ہوئی۔پھر چند سالوں کے بعد کرامت علی کرامت کی آزادغزل''کتاب'' لکھنؤ کے اکتوبر ۱۹۷۱ء کے شمارے میں شائع ہوئی،بعدازاں اپنی راہ بنا کر چلنے والے مظہر امام کے ساتھ لوگ ساتھ آتے رہے اور کارواں بنتا رہا کے مصداق یوسف جمال اوراوپر کے سطور میں درج کردہ تمام احباب چل پڑے۔

علیم صبا نویدی نے''رَدِّ کفر'' کے نام سے اپنی آزادغزل کا انتخاب شائع کیا۔اس کے بعد انھوں نے''قید شکن'' کے نام سے آزادغزل کہنے والے شعراء کی ایک بڑی تعداد کی تخلیقات کتابی شکل میں شائع کی۔اسی طرح سے تقریباً ڈیڑھ سو آزادغزل گو شعراء سامنے آگئے۔اس ضمن میں کہسار،گلبن،شاعر،اسباق اور ہند وپاک کے درجنوں رسائل نے اس نئی صنف کے فروغ میں حصہ لیا۔''شاعر''ممبئ نے شمارہ ۸۔۷۔۶،۱۹۸۳ء میں جنوری کی اشاعت میں آزادغزل نمبر شائع کیا۔جس میں تقریباً ۴۵/شعراء کی آزادغزلیں شائع ہوئیں،علاوہ ازیں آزادغزل پر مبنی ۱۰/مضامین شامل رہے۔ کرامت علی کرامت صاحب کے بموجب ظفر ہاشمی نے اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے''شاعر''کے اس خاص نمبر سے استفادہ کیا ہے۔بہر حال اب بھی پچھ نہ پچھ آزادغزلیں کہی جارہی ہیں۔کچھ رسالے اس کو شائع کررہے ہیں۔اکیسویں صدی میں علیم صبا نویدی کی دو کتابیں''غزلِ آزاد''(۲۰۰۵)اور''غزلِ شکن''(۲۰۰۸) میں شائع ہوئیں۔تاہم اگر مختلف رسالوں کے مدیروں نے دلچسپی لی تو آزادغزل کہنے والے شعراء بھی اپنی قیمتی نگارشات سے اس صنف کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

بہر حال آزادغزل کی ایجاد نے ماضی کے دوشعراءکو"آزادرباعی" کہنے پر اکسایا'ان شعراء کے اسم گرامی ہیں فیروزاور تفضیل احمد۔لیکن افسوس کہ ان دونوں نے ایک جرأت مندانہ قدم تو اٹھایا لیکن آزادرباعی کو کوئی خاص خدوخال سے آراستہ کرنے میں ناکام رہے۔ ناچیز (عبدالمتین جامی) نے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آزادرباعیاں کہیں۔جس میں رباعی کے چارمصرعوں میں سے تین مصرعے رباعی کے مسلمہ اوزان پراورصرف ایک مصرعے کےصدر،ابتدااورحشواول کےاوزان برقراررکھا۔ناچیز کےاس تجربے کومناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے بیش بہا قیمتی رسالے"کہسار" میں اپریل ۲۰۱۳ء'اپریل ۲۰۱۴ءاور ۲۰۱۵ء کے شماروں میں شائع کیا' تاہم میں نے اپنی رباعیوں کے دومجموعے"مونس سخن" اور"ترانۂ جاوید" میں شایع کیےتو تقریباً سبھی قارئین نے کہا کہ رباعی کولنگڑی لولی بنانے کی یہ کوشش صحیح نہیں ہے مگرافتخاراحمد صدیقی مدیر"شاعر"ممبئی نے اسے پسند فرمایا۔کرامت صاحب نےبھی اس تجربےکوسراہاہے۔کئی دوستوں نے اس تجربےکوآگے بڑھانے کی تلقین کی ہے۔بطور خاص عظیم رباعی گوشاعرکوثرصدیقی نے اس کی تعریف کی ہے۔ بہر حال آزادغزل کی تاریخ اوراس پر کئے گئے تجربے پر سیر حاصل معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی گئی اس کتاب کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔صوری و معنوی دونوں اعتبار سے یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔قیمت ہے ۲۰۰/روپے اور ملنے کا پتہ:تنویرظفر۔مکان نمبر۔۳۰' کراس۔۲رظہور بگان۔روڈنمبر۔۱۲رجوہر نگر۔ پوسٹ۔مانگو۔جمشید پور۔832110(جھارکھنڈ)

نام کتاب۔قشقہ (تنقیدی وتاثراتی مضامین)

مصنف۔شارق عدیل مبصر۔عبدالمتین جامی

شارق عدیل کا شماران جواں فکرادباءوشعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے بہت ہی قلیل مدت میں ادبی دنیا میں اپنی منفرد شناخت بنالی ہے۔ان کی متعدد کتابیں (شعری اورنثری مجموعے)منظرعام پرآکرمقبولیت کی سندحاصل کرچکی ہیں۔ موصوف ایک فعال ادیب ہیں۔ان کی شعری ونثری تخلیقات پچھلےکئی سالوں سےمختلف ادبی جریدوں کی زینت بنتی آرہی ہیں۔زیرنظرکتاب"قشقہ"ان کےتحقیقی وتنقیدی مضامین کاایک ایسا مجموعہ ہے جس میں اردو کےمشہورومعروف غیر مسلم شعراء کےتذکروں کےعلاوہ اردو شاعری میں ان کےمقام کےتعین کی کوشش کی گئی ہے۔

قبل ازیں دیگرادیبوں کی بھی کئی ایسی کتابیں منظرعام پرآچکی ہیں جن میں بطور خاص غیر مسلم اردوشعراء کے تذکروں کے ساتھ ان کی ادبی وشاعرانہ عظمت کااعتراف بحسن خوبی کیا گیا ہے۔صوبہ بہاروجھارکھنڈ میں ایسے ہی شعراء پرمشہور قلم کار پروفیسر مظفرحسن صاحب کی ایک کتاب بھی شایع ہوچکی ہے۔

ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہی گلشنِ اردو کی آبیاری کرنے والے کئی نامور غیر مسلم شعراء نے اپنی تخلیقات سے اردو کے دامن کو مالامال کیا ہے۔آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری وساری ہے حالانکہ سیاست کی گھناؤنی سازشوں نے اردو کو غیر ملکی زبان ہونے کی خفیہ سند دے رکھی ہے۔اس کے باوجود آج بھی مختلف اخبارات ورسائل میں غیر مسلم اردوشعراءوادبا تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہتے ہیں۔انھیں میں سے چندایک مشہوروباصلاحیت شعراء کی شاعری کے حوالے سے شارق عدیل کے مضامین زیرنظر کتاب"قشقہ"میں شامل ہیں۔جن شعراء کواس کتاب میں شامل کیا گیا ہے وہ ہیں:۔چندر بھان خیال' کنورمہندرسنگھ بیدی'نارنگ ساقی'مہندر پرتاپ چاند'پرتپال سنگھ بےتاب'ستیہ پال آنند'پروین کماراشک'ہربنس سنگھ سوہن راہی'حیرت فرخ آبادی' کرشن کمارطور'میش تنہا'پرتپال سنگھ تصوراور بیتاب وغیرہ۔ایک مضمون"کن آندھیوں میں جلتارہادیامیرا"عنوان کےتحت تلک راج پارس'ڈاکٹر ودیاساگرآنند'ڈاکٹراندرجیت نردوش'ترسیم مال(لندن)وغیرہم کی شاعرانہ عظمت کاجائزہ لیاگیاہے۔یہ تمام مضامین شارق عدیل کی تنقیدی بصیرت کےآئینہ دار ہیں۔

پہلا مضمون چندربھان خیال کی طویل نظم"لولاک"کےحوالے سے ہے۔ چندر بھان خیال اردواور ہندی کے بڑےادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان کی نظموں کےمتعددمجموعےشائع ہوچکے ہیں۔ان شعری مجموعوں پرناقدین کی جانب سے کافی کچھ لکھا جاچکا ہے۔شارق عدیل نے ان نظموں کے موضوعات پر گفتگو کرنے کے علاوہ ان میں مستعمل اوزان پر بھی بات کی ہے۔"لولاک" پیغمبر آخرالزماں کی منظوم سیرت پاک پر مشتمل کتاب ہے۔یہ مضمون واقعی لائقِ تحسین ہےاورشارق عدیل کی علمی وفنی بصیرت سےروشناس کراتا ہے۔

اسی طرح کنورمہندرسنگھ بیدی کی نظموں کوہندوپاک کے تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی گئی ہے۔کنورمہندرسنگھ بیدی کی دلی تمناتھی کہ ان دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان دوستی قائم ہو۔اس بات کولےکرانھوں نےنظمیں لکھیں۔اس مضمون سےکنورمہندرسنگھ بیدی کےانسانی جذبے کی عکاسی ہوتی ہے۔

"میخانہ اردوکاپیرمغاں نارنگ ساقی"نامی مضمون کوبھی بڑے دل پذیر اسلوب میں تحریرکیاہے۔اسی طرح پرتپال سنگھ بیتاب پردودومضامین ہیں۔ستیہ پال آنند'کرشن کمارطوراور پروین کماراشک جیسےمشہورومعروف شعراءکی شاعری پربھی سیرحاصل بحث کی گئی ہے۔تلک راج پارس کی مادری زبان سندھی ہےلیکن اردو غزل کی زلف گرہ گیر کےاسیرہوکرسیکڑوں غزلیں کہہ چکے ہیں۔شارق عدیل کی جادو بیانی"پتے شورمچاتے ہیں اور'ایک مطالعہ"سےبھی مترشح ہے۔اسی طرح لندن کی موجودہ سیاست کاایک سرگرم رکن ہونے کے باوجودڈاکٹرودیاساگرآننداردوکی زلف سنوارنے میں منہمک ہیں۔اس مضمون میں ان کی دوہانگاری پرمدلل بحث کی گئی ہے۔

بہرکیف"قشقہ"ایک ایسی کتاب ہےجوہمیں اردوکےغیر مسلم شعراکی ادبی خدمات سےروشناس کراتی ہے۔اسےایک ادبی دستاویزہی کہیں گےجس سے ریسرچ اسکالراستفادہ کرسکتے ہیں۔'امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی کافی پذیرائی ہوگی۔کاغذاورسرورق دیدہ ذیب ہے۔قیمت ہے ۲۵۰/روپےاورمصنف کاپتہ:شارق عدیل۔پوسٹ مارہرہ۔ضلع ایٹہ۔207401(یوپی)

طرحی مشاعرہ

مصرعِ طرح ''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے'' پر غزلیں پیش ہیں۔ اگلے شمارے کے لیے طرح نوٹ فرمائیں: ''چلا ہوں پھر اسی ظالم سے کہنے داستاں دل کی (اختر علی تاہری) قوافی: دل، محفل، ساحل وغیرہ غیرہ۔ ردیف۔ ''کی''۔ پانچ اشعار پر مشتمل آپ کی طرحی غزل ۱۵؍نومبر ۲۰۱۷ء تک ہمیں مل جانی چاہیے۔ رسالہ اگر تاخیر سے ملے تو وصول یابی کے ایک ہفتے کے اندر ارسال کرسکتے ہیں۔ (ادارہ)

عبدالمجید فیضی (سمبلپور)
موبائل۔ 9778291038

آپ نے خود ہی جسے سر پہ بٹھا رکھا ہے
آسماں، دشمنِ جاں سر پہ اٹھا رکھا ہے

بھولے بھٹکے شبِ ظلمت میں کوئی آجایے
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

آپ آئیں تو مری ہوگی بڑی خوش بختی
اپنے کاشانے کو مدت سے سجا رکھا ہے

مہرباں! مجھ سے خطا جو بھی ہوئی کردیں معاف
میں نے ہر تلخی و رنجش کو بھلا رکھا ہے

فیضی کیوں بزم کو رنجور کیے جاتے ہیں
آپ نے درد کا کیوں قصہ سنا رکھا ہے

ایڈوکیٹ اجمل محسن (ورنگل)
موبائل۔ 8763623951

قوم نے میری عجب حال بنا رکھا ہے
فانی دنیا سے عبث دل کو لگا رکھا ہے

چاہتا وہ جو ہے کرتے ہو بلا چون و چرا
نفس کو تم نے بہت سر پہ چڑھا رکھا ہے

اس جگہ دن میں بھی رہتا ہے اندھیرا شب کا
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

وسوسہ دل میں نہ داخل ہو کہیں چھپ چھپ کے
میں نے لاحول کا دربان بٹھا رکھا ہے

اپنے آباء کی ہدایت کے مطابق محسن
بھائی چارے کا چلن میں نے روا رکھا ہے

الحاج محمد عبدالحمید الحق قادری (کریم نگر)
موبائل۔ 9849291973

وقت بے وقت قسم کھانے اٹھا رکھا ہے
مجھ کو طاقوں میں سلیقے سے سجا رکھا ہے

مجھ کو پڑھنے کی نہ توفیق ہوئی تم کو کبھی
مدتوں مجھ کو نگاہوں سے جدا رکھا ہے

ساری رعنائی جہاں بھر کی فریب خاطر
ایسی دنیا سے میاں دل کو لگا رکھا ہے

گھر کو ویرانہ سمجھ لیں نہ زمانے والے
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

زندگی تجھ سے وفا کرتا بھلا میں کب تک
میری تقدیر میں لازم وہ فنا رکھا ہے

ساغر ملارنوی
راجستھان

عشق میں تیرے زمانے کو بھلا رکھا ہے
میں نے تیرے لیے کیا کیا نہ گنوا رکھا ہے

اب نہ کر میرے مسیحا تو مداوا غم کا
آشنا میں نے بھی اب غم کو بنا رکھا ہے

تری گستاخ نظر کا ہے قصور اے گل چیں
شور گلشن میں عنادل نے مچا رکھا ہے

اے شبِ تار! بھٹک جایے نہ رہگیر کوئی
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

ہم فقیروں کو ضروری نہیں دولت ساغر
اپنی غربت کو بھی شاہانہ بنا رکھا ہے

معین شفق (بھدرک)
موبائل۔ 9853639623

تیری صورت ہے بھلی نام بھلا رکھا ہے
کام بھی کرلے بڑا نام میں کیا رکھا ہے

کوئی رستہ ہمیں ملتا ہی نہیں منزل کا
زندگی تونے کہاں ہم کو پھنسا رکھا ہے

ہر کسی کو نظر آجاتا ہے اپنا چہرہ
میں نے ہر شعر کو آئینہ بنا رکھا ہے

ان اندھیروں میں ملے راہ ہر اک رہرو کو
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

منفرد سب سے نظر آتا ہوں محفل میں شفق
اپنے ہر شعر کو اوروں سے جدا رکھا ہے

قدیر احمد قدیر۔ گڈک (کرناٹک)
موبائل۔ 9980208578

چشم و ابرو نے جو دیوانہ بنا رکھا ہے
دل نے ہر گام پہ اک حشر بپا رکھا ہے

جب سے خوشیوں نے پتہ گھر کا بھلا رکھا ہے
ہم نے بھی غم کو کلیجے سے لگا رکھا ہے

تیرے بخشے ہوئے زخموں کو بھلاؤں کیسے
شہرِ دل کو انھیں تحفوں سے سجا رکھا ہے

خیر مقدم کرے یہ روشنی رہگیروں کا
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

گو تخیل کی ہے پرواز فلک تک لیکن
پاؤں دھرتی پہ قدیر ہم نے جما رکھا ہے

سید اسلم صدا آمری (چنئی)
موبائل۔ 9444752605

اب کے طوفاں ہی کو فانوس بنا رکھا ہے
اک دیا ہم نے ہواؤں میں جلا رکھا ہے

آرزو تیری، طلب تیری، تمنا تیری
تیری چاہت کے سوا زیست میں کیا رکھا ہے

صبح کا بھولا سرِ شام نہ آجایے کہیں
ہم نے یہ سوچ کے دروازہ کھلا رکھا ہے

روشنی گھر کی مری تیرہ زدوں تک پہنچے
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

شعر سنگلاخ زمینوں میں صدا نے کہہ کر
ریگِ صحرا میں بھی گلشن کا سجا رکھا ہے

امجد سلیم (کریم نگر)
موبائل۔ 9550664623

ظالموں نے یہاں کہرام مچا رکھا ہے
عدل و انصاف زمانے نے بھلا رکھا ہے

آندھیاں کفر کی چلتی ہیں زمانے بھر میں
ہم نے ہر حال میں ایمان بچا رکھا ہے

اپنے مہمان کی مہمان نوازی کے لیے
اپنے گھر کو بھی قرینے سے سجا رکھا ہے

سیکھیے اس سے ذرا فہم و فراست کا ہنر
علم کا جس نے بھی گنجینہ چھپا رکھا ہے

ایک ظالم کی حکومت ہے وطن میں امجد
جس نے کمزوروں پہ ہر ظلم روا رکھا ہے

یونس عاصم (ڈھینکانال، اڑیسہ)
موبائل۔ 7789811686

اس نے جو حسن کا بازار سجا رکھا ہے
ایک عالم کو بھی دیوانہ بنا رکھا ہے

جس کی صحبت اسے کھلتی رہی کل تک، اس کو
آج کیا بات ہے پہلو میں بٹھا رکھا ہے

میں نے حق بات فقط تم سے کہی تھی، لیکن
شہر کے لوگوں نے طوفان مچا رکھا ہے

کل اسی بات پر تجھ کو بڑا صدمہ ہوگا
آج جو میری صداؤں کو دبا رکھا ہے

آزمانا ہے مجھے حوصلہ طوفانوں کا
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

شعور سمبلپوری
سمبلپور (اڈیشا)

نفسِ امارہ کو قبضے میں سدا رکھا ہے
اپنے ایمان کو یوں میں نے بچا رکھا ہے

ایک ہنگامہ بپا رہتا ہے ہر وقت یہاں
آپ نے کیسا یہ ماحول بنا رکھا ہے

غیر تو غیر ہیں غیروں سے کریں کیا شکوہ
مجھ کو تو اپنوں نے بھی غیر بنا رکھا ہے

ٹھوکریں کھائے نہ رہگیر اندھیرے میں کوئی
''اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے''

سرخرو کیوں نہ رہے سب کی نظر میں وہ شعور
اپنی فطرت میں جو انداز جدا رکھا ہے

قسیم سہسرامی (بھوجپور)

موبائل۔9122636792

دل کے آئینے میں جو عکس چھپا رکھا ہے
آپ کی یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے

ان دنوں شہر کے حالات بہت نازک ہیں
کربلا شہر کو لوگوں نے بنا رکھا ہے

ہر خوشی اپنی ہے مخصوص زمانے کے لیے
اپنے حصے میں فقط کرب و بلا رکھا ہے

سوکھتا ہے تو لگا دیتا ہے نشتر کوئی
رشتہ داروں نے مرا زخم ہرا رکھا ہے

وہ مجھے بھول گیا ہے مگر میں نے قسیم
اس کے ہر زخم کو سینے سے لگا رکھا ہے

ایوب عادل (ہگلی)

موبائل۔9681650900

پیار کی اوٹ میں نفرت کو چھپا رکھا ہے
اور پھر اس نے مجھے دوست بنا رکھا ہے

اپنی تنہائی میں وہ پھوٹ کے روتا ہے بہت
جس نے چہرے کو تبسم سے چھپا رکھا ہے

تیرا بے باک قلم جو کہ ہے نشتر کی طرح
سچ بتاؤں مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

آپ کے آنے کی امید ابھی ہے باقی
"اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے"

آج کے دور میں سچ بولنے والا عادل
اپنی پہچان کو لوگوں سے چھپا رکھا ہے

فیضان عزیز

رامیشور پور روڈ۔ٹیابرج

اشک پلکوں پہ جو میں نے سجا رکھا ہے
اس نے ہر بات کا افسانہ بنا رکھا ہے

خانۂ دل مرا رہتا ہے منور ہردم
ان کی یادوں کو جو سینے سے لگا رکھا ہے

کس طرح پہنچیں گے ہم منزلِ مقصود تلک
اپنے پرکھوں کی نشانی کو بھلا رکھا ہے

ظلمتِ شب میں نہ بھٹکے گا مسافر کوئی
"اس لیے در پہ دیا میں نے جلا رکھا ہے"

میرے کردار میں فیضان نہیں کج ہے کوئی
حسن و اخلاق کو سینے سے لگا رکھا ہے

طاہر حسین طاہر (ناندیڑ)

موبائل۔8087570387

ہے غلط بات کہ طوفان اٹھا رکھا ہے
ہم نے جذبات کو قابو میں سدا رکھا ہے

بس اسی واسطے خاموش سدا رہتے ہیں
ہم کو معلوم ہے تکرار میں کیا رکھا ہے

کوئی رستہ نہ بھٹک جایے اندھیرے میں کہیں
"اس لیے در پہ دیا ہم نے جلا رکھا ہے"

پھیلتی جاتی ہے زہریلی ہوا ہر جانب
یہ شجر کس نے عداوت کا لگا رکھا ہے

کارواں دیکھنا رستے میں لٹے گا طاہر
تم نے رہزن کو جو سالار بنا رکھا ہے

ادب پیما

(ادبی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیاں)

ملنگوا، نیپال میں ایک طرحی شعری نشست

حضرت شاہد نوری ملنگوی کی یاد میں ۲۲ رمئی ۲۰۱۷ء منگل کے دن میں ایک بجے جامعہ شاہدیہ کوثر اسلام کے ہال میں ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی کی صدارت میں ایک طرحی شعری نشست کا انعقاد ہوا، جس میں علاقائی شعرائے کرام نے شرکت فرما کر اپنی رنگارنگ تخلیقات سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس کی نقابت نقیب ہندو نیپال مولانا پھول محمد نعمت رضوی نے فرمائی۔ سامعین بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ سامعین کی فرمائش پر ایک بار پھر غیر طرحی دور کا آغاز ہوا۔ صدر مجلس ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی کے مختصر خطاب و کلام کے بعد نشست کی برخواستگی کا اعلان کرتے ہوئے عید کے دوسرے دن عید ملن و طرحی نشست کے لیے ایک مصرع طرح بھی دیا گیا:

"گھٹا نہ برسے تو دریا چڑھا نہیں کرتے"

منتخب اشعار حسبِ ذیل ہیں:

جنت سے ساتھ لائے زمانے گزر گئے۔ اب تک سمجھ نہ پائے زمانے گزر گئے

(ڈاکٹر وصی مکرانی واجدی)

گلشن کا ذمہ جانے کس کم بخت نے لیا۔ پھولوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

(عشرت وارثی)

ہر شاخ گل پہ بلبلیں بھنورے اداس ہیں۔ پھولوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

(ساجد مڑپاوی)

میں سوچتا ہوں گھر سے کیوں برکت چلی گئی۔ مہمان گھر میں آئے زمانے گزر گئے

(نظام بسمل قادری)

فیضی چلو ابھی چلیں ہم سوئے والدین۔ دکھ سکھ انھیں سنائے زمانے گزر گئے

(فرقان فیضی)

آجائے موسم پھر سے وہ فصل بہار کا۔ پھولوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

(تحسین رضا منظر کھٹونوئی)

صورت کسی کی بھائے زمانے گزر گئے۔ اب تک نہ بھول پائے زمانے گزر گئے

(نسیم نورانی)

گلشن کو انتظار نسیم بہار ہے۔ پھولوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

(پھول محمد نعمت رضوی)

میکائل رہبر، صدام مظفر پوری، صفدر صدف، اختر کھٹونوی، احمد رضا پرسا موڑ کے علاوہ دیگر کئی اور شعرائے کرام نے بھی اپنے کلام پیش کئے تھے۔

ہوڑہ میں نعتیہ مشاعرہ کامیابی سے ہمکنار

(محمد علی طارق + اشرف رضا قادری) گزشتہ 23 جولائی بروز اتوار شام سات بجے سیون اسٹار اسپورٹس کلب، پی ایم بستی تھرڈ لین، شیب پور، ہوڑہ کے زیر اہتمام ایک شاندار نعتیہ مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی صدارت معروف شاعر جناب حبیب ہاشمی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض جناب شکیل سیوانی نے انجام دیئے۔ اس موقع پر جن شعرائے کرام نے شرکت کی اور اپنے کلام بلاغت سے سامعین کو نوازا اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: حبیب ہاشمی، فیروز اختر، مشتاق ہاشمی، آتش رضا، فہیم انور، مشتاق دربھنگوی، عبدالرحیم ہلچل، ڈاکٹر سلطان ساحر، شمیم غازیپوری، اسرار آصف، شہاب الدین فیض، شوکت علی صادق، محمد علی طارق، اشرف رضا، ابوالحسن نوری، جاوید مجیدی اور مخدوم ارشد حبیبی۔ یہ مشاعرہ رات گیارہ بجے کامیابی کے ساتھ اختتام پزیر ہوا۔

واجد علی شاہ اختر اکاڈمی کے زیر اہتمام ماہانہ شعری نشست

لکھنؤ۔ 31 جولائی، نواب واجد علی شاہ اختر اکادمی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں میں اکادمی کی ماہانہ شعری نشست معروف شاعر قیصر جونپوری کی صدارت اور شکیل گیاوی کی نظامت میں منعقد ہوئی۔ بطور مہمان خصوصی استاد شاعر مرزا شارق لاہرپوری اور بحیثیت مہمان اعزازی حکمت اللہ خاں حکمت شاہ آبادی و موسی رضا نظمی شریک ہوئے۔ مہمانوں کا استقبال اکادمی کے نائب صدر ڈاکٹر منصور حسن خاں اور ڈاکٹر ثروت تقی نے کیا۔ خصوصی طور پر شریک ہونے والوں میں حافظ ابوالکلام، مصور احمد اور محمد ایوب خان کے نام قابل ذکر ہیں۔ اظہار تشکر صدر اکادمی عارف محمود آبادی نے کیا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی: قیصر جونپوری، شارق لاہرپوری، حکمت اللہ حکمت، عارف محمود آبادی، ڈاکٹر منصور حسن، وصی جونپوری، نیلوفر خاں نیل، عتیق ارحم، شکیل گیاوی، موج لکھنوی، سید آلِ ہاشم، یونس رحمان الہ آبادی، موسیٰ

رضاؔ، رضوان فاروقی، محمد فیصل خاں ساحرؔ، عابد علی شعلہ، شاہد رضوی، صغیر الحسن صغیرؔ، سلیم تابش، حسن اعظمی، ڈاکٹر محسن فتح پوری، محمد رضا لکھنوی، خالد فتح پوری، سرور مظفر پوری، ندیم کراروی، عامر مختار، عاشق رائے بریلوی۔
نشست کے اختتام پر صدر بزم عارف محمود آبادی نے شرکاء اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

کہکشانِ ادب بھوپال کے زیرِ اہتمام ماہانہ مشاعرہ اور استقبالیہ تقریب بہ اعزاز صابر ادیب

صابر ادیب اعزاز قبول کرتے ہوئے

’’کہکشانِ ادب‘‘ بھوپال کی ایک فعال ادبی تنظیم ہے جس نے گزشتہ ۵/اگست کو شب سرائے سکندری جمعراتی ہال میں مشاعرہ اور استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا۔ شہر کی مشہور و معروف ادبی شخصیت صابر ادیب اور ممتاز معالج ڈاکٹر کے۔ سی۔ گیمتی کی اس موقع پر انجمن کے سرپرست اور سابق وزیر جناب سید عارف عقیل نے شال پوشی کی اور سپاس نامہ پیش کیا۔ اعزاز یافتہ شخصیات نے اپنی تقریر میں جناب عارف عقیل کو ان کی ادب نوازی اور خدمت خلق پر خراجِ تحسین پیش کیا۔

اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر اعظم نے فرمائی اور نظامت کے فرائض عارف علی عارفؔ نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ صابر ادیب نے منتخب کلام پیش کیا جس سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ یہ مشاعرہ دیر رات تک کامیابی سے چلتا رہا۔ شریک شعرا کے اسمائے گرامی: ظفر صہبائی، ڈاکٹر یونس فرحت، انعام اللہ لودھی، صابر ادیب، منظر بھوپالی، فاروق انجم، ڈاکٹر اعظم، ایاز قمرؔ، اقتدار افسرؔ، مسعود رضا، وجے تیواری، مسعود اختر ناروی، جلال میکش، اشرف علی اشرفؔ، ضیا فاروقی، عابد کاظمی، رقیب انجم، خالدہ صدیقی، سیما نازؔ، محبوب احمد محبوبؔ، مظفر طالبؔ، مصداق جعفری، طاعت فرازؔ، نشتر بھارتی، حنیف سوزؔ، اسماعیل شاکر، فاضل فیض، انور شیخ انور، اشتیاق زیدی، ضیاالحق ضیا، انور رضیائی، سلمان حیدر، اظہر ضیائی اور وجے پنتھی۔
انجمن کے صدر محمد ایوب صاحب کے ہدیۂ تشکر کے ساتھ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ (کولکاتا) کا سالانہ مشاعرہ

(ایاز احمد روہوی) گزشتہ 15 اگست کی شب ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ (کلکتہ) میں ملک کے 70 ویں جشن آزادی کے موقع پر منعقدہ سالانہ مشاعرہ بزرگ شاعر جمال احمد

مشتاق دربھنگوی اپنا کلام پیش کرتے ہوئے۔

جمال (مروئی والا) کے زیر صدارت توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔ اس مشاعرہ میں سامعین کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور شعرائے کرام کو داد و تحسین سے نواز کر مشاعرے کو یادگار بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ مشاعرے کا باضابطہ آغاز راقم الحروف کے افتتاحی کلمات سے ہوا۔ نقیب مشاعرہ جناب ضمیر یوسف نے ملک کی آزادی میں اردو شاعری کا حصہ اور ہزاروں علمائے کرام کی شہادت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سامعین کو آزادی کی 70 ویں سالگرہ کی مبارکباد دی نیز ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کی مجلس منتظمہ کی اردو دوستی کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ شہر کا ایک ایسا قدیم ملی، سماجی اور فلاحی ادارہ ہے جو بغیر کسی نام و نمود کے انتہائی خاموشی سے اپنی تہذیبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے اس تہذیبی اور روایتی مشاعرے میں کل 17 شعرائے کرام نے شرکت کی جن کے اسمائے گرامی ہیں: جمال احمد جمال، حلیم صابر، ضمیر یوسف، اقبال طالب، فراغ روہوی، اکبر حسین اکبر، ارشاد آرزو، ریحانہ نواب، مشتاق دربھنگوی، نسیم فائق، شگفتہ یاسمین غزل، نظیر راہی، ارم انصاری، احمد معراج، سہیل خان سہیل، بشریٰ سحر اور شہنور حسین شبنم۔ مشاعرے کو کامیاب بنانے میں ادارہ کے نائب صدر اور لٹریری سیکشن کے چیئرمین کوثر احمد، جنرل سکریٹری محمد عزیز الحق، سوشل سکریٹری محمد انور، لائبریری سکریٹری اکرام حسین، خازن نیاز الدین احمد، محمد انیس الدین، تمیز الدین کے علاوہ جملہ اراکین و اسٹاف پیش پیش رہے۔ ☆☆☆

معروف شاعر گوہر شیخ پوروی نہیں رہے

یہ خبر ادبی حلقوں میں افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہندوستان گیر شہرت کے مالک گوہر شیخ پوروی گزشتہ ۱۴ ستمبر کو حرکتِ قلب بند ہو جانے پر اچانک انتقال فرما گئے۔ موصوف ایک معتبر شاعر ہونے کے علاوہ ماہرِ عروض بھی تھے اور عروض پر ان کی ایک کتاب شایع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ وہ ادبی محاذ کے دیرینہ کرم فرماؤں میں سے بھی تھے اور ابتدا سے ان کی سرپرستی ہمیں حاصل تھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت کرے۔

☆☆☆